بیسویں صدی کے ایک شاہی دربار کی باغ و بہار
زندگی ایک اعزازی مصاحب کا چشم دید بیان

صدق جائسی

حسامی بک ڈپو مچھلی کمان حیدرآباد

بار اوّل .... پانچ سو

بار دوم

کتابت .... محمد نورالدین خوشنویس

پرنٹر سنڈیکیٹ پرنٹرس چھتہ بازار

قیمت (15/-) روپے

ناشر ..... حسامی بک ڈپو چارکمان حیدرآباد

پیش نامہ

از قلم صدق رقم جناب مولانا عبدالماجد صاحب دریا بادی

بادشاہوں، والیانِ ملک، رئیسوں، امیروں کی زندگی، ہم عوام اور سفید پوشوں سے اتنی الگ ہے کہ ہمیں اس کا پورا پورا اندازہ بھی نہیں ہو سکتا، اور جب کبھی ان کی کوئی جھلک ہلکی سی بھی اتفاق سے نظر آجاتی ہے تو ہم دنگ اور حیرت زدہ رہ جاتے ہیں۔ وہ شاہانہ یا نیم شاہانہ زندگی اخلاقی اعتبار سے کس درجہ پست اور بہیمانہ ہوتی ہے، یہ سوال الگ ہے، یہاں ذکر صرف اس کا ہے کہ وہ ہم سے دور، الگ اور بیگانہ کتنی ہے!

ان امراء اہلِ ریاست کا کھانا پینا، رہنا سہنا، سونا جاگنا، ان کی مسرت وغم، ان کی محبت ونفرت، ان کے کھیل کود، ان کا برتاؤ قریبی عزیزوں اور اہلِ خاندان کے ساتھ، ان کے شوق اور دلچسپیاں، ان کے عیش منانے کے طریقے، ان کے ہاں ولادت اور موت کے وقت کی رسمیں، ان کی بخشش اور فیاضیاں، ان کے جور وستم اور جلا دیاں، ان کی عبادتیں، ان کی ضیافتیں ان کے صبح وشام، غرض ان کی زندگی کے چھوٹے بڑے سارے ہی شعبے، ہم عامۃ الناس کے لئے اعجوبہ ہی کا حکم رکھتے ہیں۔ ہم دیکھیں تو حیرت کریں، سنیں تو یقین کرنے پر طبیعت آمادہ نہ ہو۔

ضرورت اور بڑی ضرورت اس کی تھی کہ کوئی ان سرکاروں، درباروں میں رہ کر ان کے اندر چل کر اور پھر کر، ان کی خلوت اور جلوت میں رسائی حاصل

کہ جیسے بیان کی عکاسی کاغذ کے صفحات پر کر کے دوسروں کو بھی ان جلوؤں کی سیر میں شریک کر لے۔"

دو شرطیں ایسے اہلِ قلم کے لئے لازمی ہیں۔ ایک یہ کہ اسے اپنے موضوع پر عبور حاصل ہو، اور صحیح معنوں میں گھر کا بھیدی ہو، محض اٹکل پچو، سنی سنائی باتوں پر عمارت کھڑی کر دینے والا نہ ہو۔ دوسری یہ کہ جو کچھ بھی لکھے اپنے علم ویقین کے مطابق سچ ہی سچ لکھے۔ مبالغہ نہ مدح میں کرے، نہ قدح میں، مقصد محض واقعہ نگاری ہو، ذکر، ہجو یا تحسین۔

مدت کے انتظار اور آرزو کے بعد، خوشی اور بڑی خوشی کی بات ہے، کہ ایک ایسے اہلِ قلم نے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے جو ہر طرح اس کے اہل ہیں۔ صدق جائسی صاحب صرف تخلص 'صدق' رکھ لینے کے گنہ گار نہیں۔ ان کا واقعی صدق رقم ہے۔ انھیں غرض نہ ہجو نگاری سے ہے، نہ منقبت سرائی سے، ان کے پیشِ نظر صرف صحیح مصوری ہے۔ قدرت نے انھیں، دکن کی سی سرکار دربار میں پہنچا دیا تھا، جہاں وہ برسوں اندر باہر رہ کر پوری طرح اس کا مطالعہ بھی کر سکے۔ بظاہر انھوں نے صرف ایک معاصر شاعر اور درباری کے آغاز و انجام پر لکھنا چاہا۔ لیکن قدرت کو ان کی قلم کاری سے اور بھی کام لینا مقصود تھا، دانستہ یا نادانستہ وہ پوری روداد شاہِ دکن کے جونیر پرنس کے دربار کی لکھ گئے اور داد وہ تاریخ دونوں کی بہ یک وقت ایک گراں قدر خدمت انجام دے گئے۔ ان کی یہ کتاب جو کچھ ایسی ضخیم بھی نہیں، اپنے اندر معنویت کی ایک پوری دنیا آباد رکھتی ہے شاعر، ادیب، نقاد، مورخ، سوانح نویس سب ہی اس سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں، بہت کچھ جان سکتے ہیں۔ بہت کچھ سبق حاصل کر سکتے ہیں۔ شگفتہ بیانی کا یہ عالم ہے کہ ایک بار شروع کر کے کتاب کو نہ ختم کئے طبیعت ماننے کی،

نہیں۔ اور دلعات جابجا ایسے عجیب و حیرت انگیز کہ حقیقت پر افسانے کا گمان گزرنے لگے اور یاد فسانۂ عجائب کی تازہ ہونے لگے۔

جو ناشر اس کی اشاعت کی توفیق پائے گا، وہ خیر کتاب کی مقبولیت سے اپنا بھلا تو کر ہی لے گا، باقی اردو زبان ملک و قوم کی بھی اچھی خدمت کر جانے والوں میں ان شاء اللہ اپنا نام پائے گا۔

دریاباد۔ بارہ بنکوی (دستخط) عبدالماجد

۱۴/ اپریل سنہ ۱۹۶۰ء

اقتباس

از

گرامی نامہ بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق

بنام مصنف

"آپ کی کتاب "دربارِ دُربار" ایک نادر چیز ہے۔ آپ نے جس خوبی سے شاہ زادے کے دربار اور وہاں کے اُمراء کے حالات اپنی دلکش نثر میں بیان کئے ہیں ان کو تاریخی حیثیت حاصل ہو جائے گی۔ یہ آخری دربار تھا۔ اب نہ ایسے شاہ زادے ہوں گے اور نہ ایسے دربار اور نہ آپ جیسے لکھنے والے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ کتاب نہایت مقبول ہوگی اور اردو ادب میں اسے خاص مقام حاصل ہوگا۔"

زمانہ کبھی یکساں نہیں رہتا، نہ دنیا ہمیشہ کسی کا ساتھ دیتی ہے۔ قطب شاہی خاندان کے عروج و زوال کا حال تاریخوں میں پڑھا تھا، دولت آصفیہ کا عروج و زوال آنکھوں سے دیکھا۔ حیدرآباد ایسی جگہ نہ تھی جسے کوئی خوشی سے چھوڑتا مگر مجبوری بُری ہوتی ہے، آخر ایک دن محبوب شہر چھوڑنا ہی پڑا، جس کے ذرّے ذرّے سے مجھے محبت تھی۔ دل اس خیال سے پاش پاش تھا کہ اب یہ خوبصورت شہر ہمیشہ کے لیے چھوٹتا ہے۔ مگر صبر کی سِل چھاتی پر رکھ کر ناگوار کو بھی گوارا کیا اور نومبر ۱۹۵۳ء کے آخری ہفتہ میں اُس عروس البلاد کو، جس میں عمرِ عزیز کے پورے ۲۶ سال اطمینان اور چین سے بسر کئے تھے۔ اس عالم میں الوداع کہا کہ دل پاش پاش اور آنکھیں نم تھیں۔ دوستوں اور عزیز شاگردوں کو گلے لگا کر ان سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہونے کو پتھر کا دل درکار تھا، اپنے میں اس کی ہمت نہ پائی۔ صرف اپنے رفیق کتوں، مسٹر جیمس اور مسٹر فاکس کو گلے سے لگایا، اور ان سے باچشمِ نم دیر تک باتیں کیں۔ دونوں وفادار رفیق سر جھکائے حزن و ملال کی تصویر بنے سامنے کھڑے تھے۔ زبان ہوتی تو شاید وہ بھی اپنے دلی جذبات کے اظہار سے دریغ نہ کرتے۔

نواب کاظم جنگ، اگر اپنا وعدہ پورا کرتے تو شاید حیدرآباد مجھ سے چھوٹتے جی نہ چھوٹتا، مگر مشیت کو تو کتاب "دربارِ دُربار" لکھوانی منظور تھی اس نے آخر

ملکی سرٹیفکٹ میرے ہاتھ لگا تھا کہ شہر میں وبائے طاعون پھوٹ پڑی اور میں بادلِ ناخواستہ اس عروس البلاد سے بے نیل مرام وطنِ مالوف کو واپس چلا گیا۔

میری واپسی کے دو یا تین برس بعد میرے شفیق حضرت جوش ملیح آبادی واردِ حیدر آباد ہوئے۔ کہاں ٹھہرے کس سے ملے اسے خدا ہی بہتر جانتا ہے کیوں کہ میں اس وقت بھوپال میں تھا۔ اتنا معلوم ہوا کہ نواب عماد الملک نے اعلیٰ حضرت سے سفارش فرمائی اور قادر نواز جنگ نے انھیں بندگانِ عالی کے حضور میں پیش کیا۔ ان کی باریابی کا بھی بڑا لطیفہ ہے مگر میں اُسے اس لئے نہیں لکھتا کہ خود جوش اپنی خود نوشت سوانح حیات میں مجھ سے بہتر لکھیں گے۔ جوش بھی غالباً آٹھ مہینے کی مسلسل کاوش و کوشش کے بعد عثمانیہ یونیورسٹی کی شاخ دارالترجمہ میں بہ حیثیت مترجم بندگانِ عالی کے حکم سے ملازم ہوئے تھے۔

میں نے ۱۹۲۷ء کے آخری مہینوں میں سرزمینِ دکن پر دوبارہ قدم رکھا۔ میرے مکرر حیدر آباد جانے کے حالات کتابِ دربار در دربار میں نہایت تفصیل سے درج ہیں۔ ۱۹۲۸ء میں یمین السلطنت مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر کے خاص احکام سے دار العلوم میں میرا تقرر ہوا جس کی تفصیلات ناظرینِ دربار میں ملاحظہ فرمائیں گے۔

میرے تقرر کے کئی برس بعد شوکت علی خاں فانی بدایونی جوش کی تحریک پر حیدر آباد آئے اور کئی مہینے تک عزیز کمپنی میں سرکاری مہمان رہے۔ اس کے بعد دار الشفاء ہائی اسکول کی ہیڈ ماسٹری پر مہاراجہ بہادر کے حکم سے ملازم ہوئے۔

ان کی ملازمت کے بعد ماہر القادری صاحب غالباً مولانا عبد القدیر بدایونی

کے توسط سے عین عنفوانِ شباب میں حیدر آباد آئے اور بیس برس کے بعد
مہاراجہ کے حکم سے ہائی کورٹ میں مامور ہوئے۔

جونیر پرنس شاہزادہ معظم جاہ بہادر کے دربار میں باریابی کا
شرف اوّل جوشؔ کو حاصل ہوا۔ جوشؔ نے فانیؔ کو پہنچایا۔ فانی کے بعد
ماہرؔ باریاب ہوئے۔ ان کی باریابی کی تفصیلات کا علم مجھے نہیں۔ ان کے بعد
نجمؔ آئے اور نواب شہید یار جنگ کے وسیلے سے دربار میں رسائی حاصل
کی۔ نجمؔ جونیر پرنس کے استاد اور تنخواہ دار ملازم تھے۔ سب کے آخر میں فانیؔ
نے مجھے گھسیٹا جس کی تفصیلات کتاب میں درج ہیں۔

دربار کے متعلقین میں قابلِ ذکر یہی پانچ شاعر ہیں۔ جو عزت سے
بلائے گئے اور عزت و وقار سے رہے۔ ان کے علاوہ بہت سے اور بھی ہیں
جن کا ذکر میں اس لئے نظر انداز کرتا ہوں کہ وہ چند روز میں ذلت کے ساتھ
نکالے گئے اور جونیر پرنس سے جلیل القدر شاہزادہ کی محفل میں جگنو کی طرح
کچھ دیر کے لئے اپنی چمک دکھا کر گمنامی کے اندھیرے میں ناپید ہو گئے۔

دربار میں جن لوگوں کے نام آئے ہیں، وہ اصلی ہیں۔ صرف المک جنگ اور
ڈھمک جنگ دو فرضی کردار ہیں۔ ان سے مراد وہ ذی مرتبت لوگ ہیں جو اکثر یا
کبھی کبھی حاضرِ دربار ہوتے تھے اور رات بھر شاعروں میں اپنا وقت خراب کرتے تھے۔
نہ شاعر تھے، نہ سخن فہم، دنیا جانتی تھی کہ وہ مردوں کا کہا ہوا سناتے ہیں شعر کو بے سمجھے شور
تحسین سے آسمان سر پر اٹھا لیتے ہیں۔ مگر انہیں حضوری کی چاٹ میں یہ سارے ننگ گوارا
تھے۔ ہم خود کسی کو کچھ نہیں کہتے صرف دلی زبان ایڈیٹر اودھ پنچ کا مشہور قول دہرائے دیتے ہیں،
کہ "یہ کاغذی ٹوپی جس کے سر پر فٹ ہو جائے فھو البغلول"۔ صدق (جائسی)

۱۴ اپریل ۱۹۶۱ء (مرزا تصدق حسین)۔ کوٹھی شاہزادہ صاحب رائے بریلی (یوپی)

فانی حیدرآباد دکن میں

جوش کی عادت تھی کہ گفتگو کی ابتدا ہمیشہ ایک نئی بات سے کرتے تھے۔ اپنی اسی عادت کے مطابق ایک دن کہنے لگے " کہ فانی آج کل بہت پریشان ہے۔ آگرے میں اب ان کا کام مطلق نہیں چلتا (کام سے وکالت مراد تھی) میرے پاس ان کے کئی خطوط آئے ہیں۔ بے چارے سخت مصیبت میں مبتلا ہیں۔ سوچتا ہوں کسی موقع سے مہاراج سے عرض کروں اور انھیں یہیں بلوالوں (مہاراجہ کشن پرشاد بہادر کی طرف اشارہ تھا)۔ میں نے جواب دیا ضرور کہئے۔ بات یہیں ختم ہوگئی۔ ارادہ جوش کا تھا۔ ہفتوں پر ہفتے اور مہینوں پر مہینے گزرتے گئے۔ پھر کبھی فانی کا ذکر نہ آیا۔ چھ سات مہینے کے بعد کیا دیکھتا ہوں کہ جوش شام کے وقت اپنے گھر پر بیٹھے ہیں۔ سامنے لکڑی کا خوبصورت سا ایک تراشا ہوا ٹکڑا رکھا ہوا ہے جس پر گولائی میں باریک باریک خطوط بڑی صفائی سے کھینچے ہوئے ہیں۔ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے فرمایا بڑے موقع سے آئے ہو یہ پلینچٹ ہے اس پر بلانے سے روحیں آتی ہیں جس روح سے چاہو باتیں کر سکتے ہو۔

اب میں نے لکڑی کے اس ٹکڑے کو غور سے دیکھا جس میں چھوٹے سے ایک ڈورے کے ساتھ پنسل کا ایک ٹکڑا ابھی بندھا ہوا تھا۔ پنسل کا ٹکڑا جوشؔ نے ایک نوعمر لڑکے کو پکڑایا اور سادے کاغذ کا ایک ورق اس کے سامنے رکھ کر لکڑی کے ٹکڑے سے یوں مخاطب ہوتے "میں حافظ شیرازی کی روح سے باتیں کرنا چاہتا ہوں" تین بار اس فقرے کی تکرار کی، آخر کار لڑکے نے پنسل سے کاغذ پر لکھنا شروع کر دیا۔ پہلے حافظ شیرازی لکھا۔ جوشؔ کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا۔ مجھ سے کہنے لگے روح آ گئی۔ رسمی صاحب سلامت اور مزاج پرسی کے بعد پوچھا "آپ کس حال میں ہیں" جواب ملا "اچھے حال میں ہوں" "آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟" "بالکل نہیں" دس بیس پچاس سوال اسی قبیل کے کر کے جوشؔ نے کہا "حضرت! میرے دوست فانیؔ آج کل بڑی تکلیف میں ہیں، میں انھیں حیدر آباد بلوالوں؟" جواب ملا "ہاں بلوالو۔ یہاں انھیں ملازمت مل جائے گی، مگر چند روز انتظار کرنا ہوگا"

میں نے دیکھا کہ اس کھیل سے جوشؔ میں تازہ جوش پیدا ہو گیا اور اب وہ تذبذب جو پیشتر فانیؔ کے بلوانے میں انھیں تھا، باقی نہیں رہا۔ یہ دوسرا موقع تھا کہ فانی انھیں یاد آئے۔ اس کے بعد خاقانیؔ، انوریؔ، قاآنیؔ، عرفیؔ، ظہوریؔ، سعدیؔ، امیر خسروؔ، فردوسیؔ اور نہ جانے کن کن کی روحوں کو جوشؔ عالم بالا سے گھسیٹ گھسیٹ کر بلاتے اور اس لڑکے کے جواب سے مطمئن نظر آتے رہے۔

کبھی کبھی بیچ میں ایسا اتفاق بھی پیش آجاتا کہ جوشؔ نے عمر خیامؔ کو یاد کیا اور لڑکے نے کاغذ پر شیطان لکھ دیا۔ جوشؔ برہمی سے پوچھتے "کیوں صاحب آپ نے کیسے زحمت فرمائی؟" شیطان کہتا "زحمت کیسی، میں تو

ہر وقت ہی تمہارے ساتھ رہتا ہوں" اس پر قہقہہ پڑتا۔ احباب کہتے اچھی کہی۔ جوش ہنس کر اثبات میں سر ہلاتے، یعنی بے شک اچھی کہی۔

یہ کھیل بھی مہینوں جاری رہا اور فانی آگرے میں سختیاں جھیلتے رہے خدا خدا کر کے جوش نے مہاراجہ بہادر سے عرض کر کے فانی کی طلبی کی منظوری حاصل کر لی اور انھیں لکھ بھیجا کہ تم حیدرآباد آجاؤ۔

فانی آئے اور عزیز کمپنی میں مہاراجہ کے حکم سے ٹھہرا دیے گئے! مہاراجہ نے ان کی زبان سے ان کا کلام سُنا تو بے حد مسرور ہوئے اور تا دیر خوشنودی کا اظہار فرماتے رہے۔

اب فانی عزیز کمپنی کے بالاخانے پر مقیم تھے، دونوں وقت کی چائے اور کھانا جس وقت چاہیں منگوالیں۔ مگر سوال عیال کا تھا جو ہنوز بے سر و سامانی کے عالم میں آگرے میں قیام پذیر تھے، جن کا خیال فانی کے لیے سوہانِ روح بنا ہوا تھا۔ دوسری مشکل اس سے زیادہ سخت یہ پیش نظر تھی کہ حیدرآباد کے بے فکرے امیر زادے جن کو ہوا خوری، برج اور گپ شپ کے علاوہ کوئی کام ہی نہ تھا، ان کے لئے ایک کام نکل آیا۔ وہ صبح و شام فانی کی ملاقات کو آنے لگے ایسے میں ایک جنگ اور ڈھکمک جنگ کے ورودِ مسعود سے فانی بہت دل تنگ تھے۔ کیوں کہ ان کی رسمی خاطر و تواضع ایک مردِ شریف کی حیثیت سے فانی پر فرض تھی اور ان کی جیب اس کی متحمل نہ تھی۔ یہ مشکل کیونکر کٹی اور کس نے حل کی، اسے جوش مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔ مگر دو ہفتے کے اندر ہی آراستہ بلدہ کا ایک مختصر اور ہوادار مکان دس روپے ماہوار کرائے کا ان کو دلوا دیا گیا۔ اور وہ عزیز کمپنی سے محلہ طلے پلی میں منتقل ہو گئے۔

مہاراجہ کشن پرشاد بہادر نے دو سو روپے ماہانہ اپنی جیب سے مقرر فرما دیا۔ اور فانی کو کسی قدر سکون میسر آیا۔ اس کے بعد ہی پہلی فرصت میں وہ اپنے اہل وعیال کو بھی لے آئے، جن میں بیگم فانی کے علاوہ فیروز علی خاں اور وجاہت علی خاں دو صاحب زادے بھی تھے۔ یہی فانی کا مختصر کنبہ تھا۔ لڑکے دونوں جوان تھے مگر ان کا محبوب مشغلہ صرف ناول دیکھنا گیرم کھیلنا یا گھومنا پھرنا تھا، انھوں نے دنیا کے کسی کو کبھی التفات کی نظر سے نہ دیکھا۔ اور جس طرح ہنستے کھیلتے حیدر آباد آئے تھے اُسی طرح ہنستے کھیلتے اپنی جانیں جان آفریں کے حوالے کر دیں۔

ان صاحب زادوں میں وجاہت علی خاں نے شاید دو چار کتابیں طب کی پڑھی تھیں۔ فیروز علی خاں کبھی کسی علم و فن کے قریب نہ گئے تھے۔

اب فانی روزانہ مہاراجہ بہادر کے دربار میں حاضر ہونے لگے اور شاید جوش ہی کی تحریک پر مہاراجا بہادر نے ان کے لیے منصفی کا عہدہ تجویز کیا۔ فانی بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ تھے۔ اس لحاظ سے یہ تجویز نہایت معقول تجویز تھی۔ اگر وہ منصفی منظور کر لیتے تو یقیناً ججی سے ریٹائر ہوتے اور ساری عمر عزت و چین سے بسر کرتے۔ مگر نوشتۂ تقدیر تو یہ تھا کہ مرتے وقت دوا اور غذا دونوں سے محروم رہیں۔

فانی نے منصفی کو اس بنا پر منظور نہ کیا کہ انھیں حیدر آباد سے باہر جانا پڑے گا اور وہاں شہر کی سوسائٹی اور شہر کا ماحول انھیں نصیب نہ ہوگا۔ وہ سوسائٹی کے عاشق تھے، اور اسی سوسائٹی نے ان کے ساتھ وہ تغافل برتا جو تغافل مجرمانہ کی حد تک پہنچ گیا۔ یہ فانی کی رائے کی غلطی تھی۔ سوسائٹی دولت اور اطمینان چاہتی ہے اور اس وقت وہ ان

دولتوں سے محروم تھے۔

مہاراجا بہادر سے عرض کر دیا گیا کہ فانیؔ بیرون بلدہ جانے کے لیے راضی نہیں ہیں۔ اس حالت میں تعلیمات کے محکمے کے سوا دوسرا محکمہ نہ تھا جس میں بہ آسانی ان کا تقرر ممکن ہوتا۔ چنانچہ دارالشفا ہائی اسکول میں ہیڈ ماسٹری کے عہدے پر مامور کر دیے گئے،[1] جسے انھوں نے بخوشی منظور کر لیا۔

حیدرآباد میں ایک کہاوت لوگوں کی زبان پر ہے۔ "جس گھوڑے کی قسمت پھوٹتی ہے جھٹکے میں جوتا جاتا ہے۔ اور جس مرد کی قسمت پھوٹتی ہے تعلیمات میں ملازم ہوتا ہے۔" یہیں سے فانیؔ کی بدقسمتی کا آغاز ہوتا ہے، ملازمت کے بعد ہی ان کو ملکی سرٹیفکٹ پیش کرنا ضروری تھا۔ بغیر اس کے محاسبی سے تنخواہ جاری نہ ہوتی۔ دوسرا سوال عمر کا تھا، کیونکہ سرکاری ملازمت کے لئے ۳۰ سال عمر کی قید تھی اور فانیؔ ۵۰ برس کے ہو چکے تھے۔ ان دونوں قیود سے استثنا کی درخواست فانیؔ کی طرف سے بارگاہ خسروی میں پیش ہوئی۔ فانیؔ کی بدبختی ہر منزل پر ساتھ تھی۔ بارگاہِ خسروی سے ان کی درخواست پر اعتراض ہوا کہ جب معمولی خدمتوں پر غیر ملکیوں کا تقرر کیا جائے گا تو ملک کے تعلیم یافتہ نوجوان حصولِ ملازمت کے لیے کہاں جائیں گے؟

اس نوٹ کا پیش ہونا تھا کہ حیدرآباد کے اخباروں نے بات کا بتنگڑ اور رائی کا پہاڑ بنا دیا۔ ہفتوں بلکہ مہینوں ان اخباروں

---

[1] یکے سے بدتر ایک سواری ہوتی ہے۔

میں اہلِ ملک کی موافقت اور غیر ملکیوں کی مخالفت میں مضامین نکلتے رہے تعصب کے ان شیدائیوں کو اس وقت کی کیا خبر تھی کہ ہم یہ کلہاڑی اپنے ہی پاؤں پر مار رہے ہیں اور فانی کی مخالفت نہیں حقیقت میں اپنی ہی مخالفت کر رہے ہیں۔

خدا خدا کرکے اس طوفان کا زور گھٹا اور مہاراجا بہادر کی خاص سفارش پر فانی کی دونوں درخواستیں منظور ہو گئیں۔

اس زمانے کو فانی کے اطمینان کا زمانہ کہا جا سکتا ہے کیوں کہ ڈھائی سو اسکول سے اور دو سو مہاراجا کی سرکار سے اُن کو ماہ بماہ ملنے لگے۔

لیکن اس اسکون کو بھی فانی نے خود اضطراب سے اس طرح بدل ڈالا کہ اپنے اسکول کی انجمن سے سودی قرض لے کر موٹر خرید لی۔ اس قرض کے بعد ان کی تنخواہ سے کم و بیش سو روپے ماہانہ کی قسط قرض میں وضع ہونے لگی۔ دوسرا اسکر اپٹرول کے اخراجات اور ڈرائیور کی تنخواہ کی نذر ہونے لگا۔ اس طرح اب اسکول سے جو کچھ فانی کے ہاتھ آتا وہ صرف پچاس ساٹھ روپے کی حقیر رقم ہوتی۔

لے دے کے اب مہاراجا کے اُسی عطیے پر جو فانی کو اُن کی سرکار سے ملتا تھا فانی کی بسر اوقات تھی۔ اس آمدنی میں فانی آرام و اطمینان کے ساتھ کھانا ضرور کھا سکتے تھے، لیکن اطمینان و آرام کی زندگی ان کی قسمت ہی میں نہ تھی۔ جوشش نے ان کو جونیر پرنس کے دربار میں پہنچا دیا۔ اپنے نزدیک تو جوشش صاحب نے عنایت پر عنایت فرمائی تھی، مگر ان کی یہی عنایت بالآخر فانی کے حق میں زہرِ ہلاہل ثابت ہوئی۔ پرنس کا دربار رات کو ہوا کرتا تھا جس کی شرکت ظاہری اعزاز کے علاوہ شب بیداری

[illegible] نحدہ لکھواتی تھی۔ اور [illegible] درباریوں کے [illegible] بیہا [illegible] کا اجر
یہی اجر پندرہ برس کی مسلسل حاضر باشی میں فانی کے ہاتھ آیا۔

پچاس کے اوپر عمر، اس پر رات رات بھر کی درباداری۔ عموماً
تین چار بجے شب مصاحبت سے چھوٹتے تو بہ مشکل دس بجے دن کو بستر
سے اٹھتے اور جلدی جلدی تیار ہو کر کسی نہ کسی طرح گیارہ بجے دن تک اپنے
اسکول میں پہنچ جاتے۔ اسکول کا کام روز بروز ابتر ہونے لگا۔ انسپکٹر آف
اسکول کے پاس خفیہ رپورٹیں پہنچنے لگیں کہ فانی صاحب گیارہ بجے دن
سے پہلے اسکول نہیں آتے، اور آنے کے بعد دفتر میں آرام کرسی پر پڑے
سویا کرتے ہیں۔

فانی اپنی شرافت نفس سے ہر شخص کو شریف سمجھتے تھے
جن کو اپنا ہوا خواہ جانتے ان سے دربار کی رنگ رلیاں مزے لے لے کر
سناتے۔ اس سے قطعی بے خبر کہ آدمیوں ہی میں اہلِ نفاق بھی ہوتے ہیں۔
وہی لوگ جو دربار کی داستانیں فانی کی زبانی سنتے، شام کو جا کر من و عن
انسپکٹر آف اسکولس سے دہرا آتے تھے۔

ان شکایتوں کا اثر جو ہونا چاہیئے تھا وہ ہوا۔ مہاراجا بہادر کے
خیال سے انسپکٹر صاحب فانی سے خوش اخلاقی سے پیش آنے پر
مجبور تھے۔ وقت گزرتا رہا۔ فانی رات کو شاہ زادے کی مصاحبت اور
دن کو لولی لنگڑی ہیڈ ماسٹری کرتے رہے۔ مسلسل شب بیداریوں کی
بدولت ان کی صحت بگڑتی رہی، جس کی بدولت مہاراجا بہادر کے
دربار سے اکثر غیر حاضر رہنے لگے۔ مگر بدبختی سے فانی شاہ زادے کی
مصاحبت کو جس کا صلہ زبانی قدر دانی کے علاوہ چار سال کی حاضر باشی

یں کچھ نہ ملا تھا، اپنے حق میں کیمیا ہی سمجھا کئے۔

پانچ برس اور اسی مشقت میں گزر گئے، اور اسی عرصہ میں فانی کی عمر عزیز کے پچپن سال بھی پورے ہو گئے، جو ملازمت سے سبکدوشی کی عمر تسلیم کی گئی ہے۔ سر رشتے سے فانی کی سبکدوشی کی گئی، مگر مہاراجا ہنوز صدارت عظمیٰ کے منصب جلیل پر فائز تھے۔ انھوں نے فانی کی ملازمت میں پانچ سال کی مزید توسیع فرمادی۔

دو برس کے بعد مہاراجا بہادر اپنی خدمت سے خود ریٹائر ہو کر خانہ نشین ہو گئے۔ مہاراجا کا ہٹنا تھا کہ فانی کو حیدرآباد کے زمین آسمان بدلے ہوئے معلوم ہونے لگے۔ اب تعلیمات کے جس عہدے دار سے ملنا چاہتے ہیں، وہی عدیم الفرصتی کا ذکر کر کے ملاقات سے انکار کرتا ہے انسپکٹر آف اسکولس جو ہمیشہ سراخلاق مجسم نظر آتے تھے، اب ترش روئی سے پیش آنے لگے۔ اور ایک مہینے کے اندر فانی کو تبادلے کے احکام مل گئے۔

یہ تبادلہ ضلع ناندیڑ کی کسی تحصیل کے ہائی اسکول میں کیا گیا تھا، جہاں تحصیل دار اور منصف کے علاوہ تعلیم یافتہ آدمی ڈھونڈھے نہ ملتا احباب کے سمجھانے بجھانے سے فانی نے جا کر اپنے عہدے کا چارج ضرور لیا، مگر جس سوسائٹی کے بھوکے تھے اس کا فقدان دیکھ کر ایک ہفتے کے اندر واپس آ گئے۔ رخصت بیماری جس کی درخواست دے کر فانی واپس آئے تھے، مہینوں میں منظوری ہوتی ہے، اور منظوری کے بعد رخصت یاب کو کہیں نصف تنخواہ سر رشتے سے ایصال ہوتی ہے۔ اب تنخواہ کے نہ ملنے کا تو کوئی سوال ہی نہ رہ گیا تھا، لے دے کے وہی دو سو روپے فانی کی آمدنی تھی جو مہاراجا بہادر کی سرکار سے

ہنوز ملے جاتے ہیں۔

اس زمانے میں فانی کا محض توکل پر بھروسہ تھا۔ مصاحبت شباب پر تھی کیونکہ دوسرا کوئی کام نہ تھا۔ ان شب بیداریوں کا جو اجر فانی کو آخرت میں ملا ہو اسے وہ جانیں، دنیا میں جو صلہ ہاتھ آیا وہ طرح طرح کی شکایات تھیں جو فطرت سے اس مسلسل جنگ کی بدولت آٹے دن ہاتھ باندھے ان کے سامنے کھڑی رہتی تھیں اور بیماریاں جب کسی کو گھیرتی ہیں تو دوا دارو کے بغیر پیچھا نہیں چھوڑتیں، اور مفت دوا اسپتال کے سوا کہیں میسر نہیں آتی۔ مصاحبت کی شان اس خیراتی علاج کی روادار نہ تھی۔ دن بھر فانی چلے سے اپنے ناتواں جسم میں چستی پیدا کرنے کی ناکام سعی میں مصروف رہتے۔ رات کو شاہزادہ کے ساتھ ڈنر کھا کر قدرے توانائی پیدا کرتے اور پھر صبح تک وہی درباداری جس کے لئے وقف ہو چکے تھے۔ یہ محفلیں جن میں فانی اپنی اوقات ضائع کرتے تھے۔ وہاں کی اصطلاح میں مشاعرہ کہی جاتی تھیں، جن کا تفصیلی ذکر دربار کے سلسلے میں علحٰدہ کروں گا۔

فانی کی آمدنی گھٹ کر بہت کم رہ گئی تھیں۔ مگر خرچ کی کسی مد میں کوئی کمی نہ ہوئی تھی۔ ڈرائیور کی تنخواہ اور پٹرول کا خرچ اب بھی پہلے کی طرح موجود تھا۔ مگر یہ اخراجات پورے کس طرح ہوں۔ ان سے عہدہ براہونے کی فانی نے یہ ترکیب سوچی کہ مہاجنوں سے سودی قرض لینا شروع کر دیا۔

شام کے وقت فانی اب بھی موٹر پر ہوا خوری کے لئے نکلتے۔ کبھی کسی دوست کے گھر جاتے، کبھی باغِ عام کی فرحت بخش ہوا سے

اپنا غم غلط کرنے کی ناکام کوشش کرتے۔ ان کا خیال تھا کہ ایک نہ ایک دن شاہزادۂ والا تبار ان کا سب قرض ادا کر کے اُن کو ان مشکلات سے نجات دلا دیں گے۔ یہی خیال ان کے بعض احباب کا تھا۔

چوتھے پانچویں مہینے رخصت بیماری کی آدھی تنخواہ ہاتھ آتی وہ بھی مہاجنوں تک نہ پہنچنے پاتی۔ گوشت، دودھ، ترکاری، غلہ اسی طرح کے دوسرے متفرقات میں تقسیم ہو جاتی۔ مہاجنوں کا روپیہ سوایا اور سوائے سے ڈیوڑھا ہوتا رہا۔ جب فانی کو اپنے ڈوبنے کا یقین ہو گیا تو انھوں نے سوچا کہ تنہا کیوں ڈوبوں، مصیبت میں بھی ایک رفیق ساتھ رہے تو مصیبت کی ہولناکیاں اتنی محسوس نہیں ہوتیں، جتنی تنہائی میں معلوم ہوتی ہیں۔ اس رفاقت کے لئے انھوں نے میرا انتخاب فرمایا۔

یہ اتفاق اس طرح پیش آیا کہ ایک رات کو پرنس کے سامنے انھوں نے ایک غزل دل نہیں، قاتل نہیں کی ردیف و قافیے میں سنائی۔ پرنس نے بہت کچھ اظہار پسندیدگی فرمایا۔ فانی آداب دربار کے مطابق اپنی جگہ سے اٹھ اٹھ کر شکر گزاری کے سلام کرتے رہے۔ پھر سنجیدگی اور متانت سے بولے، شعر تو سرکار اس زمین میں میرے دوست صدق جائسی نے نکالا ہے، جسے میں اپنی ناچیز رائے میں حاصلِ زمین سمجھتا ہوں اور میرا یہ شعر پڑھ کر سنایا :

اُس کے لطفِ عام کو غیرت نہیں کرتی قبول
اور میں کم بخت لطفِ خاص کے قابل نہیں

شعر اچھا تھا ہی، پرنس بے چین ہو گئے، اور اسی وقت نجم آفندی کو حکم دیا کہ کل سرِ شام زحمت فرما کر صدق کے گھر جائیے اور ان کو ڈنر سے

پہلے اپنے ساتھ ہل فورٹ میں لے آئیے (ہل فورٹ پرنس کے محل کا نام تھا)
دو شری می شام کو یکایک نجم آفندی میرے گھر پر تشریف لائے
میں سمجھا ملاقات کی غرض سے آئے ہیں، مگر انھوں نے دو چار باتوں کے
بعد اپنے آنے کا مقصد بیان کر دیا اور مجھ سے ایفراد کیا کہ فوراً تیار ہو جاؤ
میں اپنی حاضری کا ذکر کس قدر تفصیل کے ساتھ دربار کے ذکر کے ساتھ
علحدہ کروں گا۔ ابھی اس کا موقع نہیں۔

اس طرح فانی نے مجھے بھی اسی گرداب میں ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیا،
جس میں کم و بیش دس برس سے خود ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ اب دن کی
ان ملاقاتوں کے علاوہ جو فانی سے کبھی کبھی ان کے گھر پر ہو اکرتی تھیں، رات
رات بھر دربار میں ساتھ رہنے لگا۔

اس طرح پورے سات سال مسلسل ان کی شب بیداریوں میں مَیں
بھی برابر کا شریک رہا ہوں، اور مجھ سے زیادہ فانی کو قریب سے دیکھنے
کا دوسرے کو موقع نہیں ملا۔ جو اُن کے دردناک انجام کو میری طرح من و عن
لکھ سکے۔

میں انشاء اللہ اس فرض کو پوری ایمانداری سے ادا کروں گا۔
جو کچھ فانی جیسے حساس فکر شاعر پر حیدرآباد سے شہر میں (جیسے دولت اور
تمول کی کان کہنا بے جا نہ ہوگا) گزرا، مجھے حرف بہ حرف بیان کر دینا ہے۔

دربار کی پہلی رات

پرنس کے محل (ہل فورٹ) کی خوب صورتی اور سجاوٹ کے تفصیلی ذکر کے لئے ایک دفتر چاہیے۔ میری ساری عمر اُمرا اور روسا کے ساتھ ہی بسر ہوئی ہے، لیکن جس وقت نجم کے ہمراہ ہل فورٹ کے خوبصورت احاطہ میں جو ایک سرسبز و شاداب قدآلود باڑ سے گھرا ہوا تھا، موٹر سے اترا، رعب دربار کی وحشت سے دل کی عجیب کیفیت تھی۔ جی چاہتا تھا کہ گھر پلٹ جاؤں، پرنس کا سامنا نہ کروں، مگر نجم کی موجودگی سے اس کا امکان باقی نہ رہا تھا۔

زمین کے اس وسیع و عریض فرش پر جہاں موٹر رکی تھی، کھلی ہوئی موسم بجلی کی روشنی میں ایسی خوبصورت اور جاذب نظر تھی، جس کی دل کشی کا لفظوں میں اظہار ممکن نہیں۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ دور تک لالے کا فرشِ رنگین بچھا ہوا ہے۔ نجم تو مجھ سے آئیے کہہ کر آگے بڑھے اور میں رُعب دربار سے لرزاں و ترساں ان کے پیچھے پیچھے بادل ناخواستہ ان کے ساتھ ہو گیا۔ تین یا چار سیڑھیاں چڑھ کر ہم لوگ ایک گیلری میں داخل ہوئے جس میں تاحدِ نظر نہایت خوبصورت میٹنگ کا فرش تھا اور سامنے ایک دیو پیکر حبشی، جسے مقامی زبان میں سدّی کہتے ہیں، ہاتھ میں بندوق لئے تصویر کی طرح بے حس و حرکت اس طرح کھڑا تھا گویا وہ بھی کوئی مجسمہ ہو۔ اور مجھے تو جس کا دل اس وقت کسی اختلاجی کے دل کی طرح زور زور دھڑک

رہا تھا، اس وقت وہ مجسمہ ہی معلوم ہوا۔ چند قدم اس گیلری میں چل کر ہم داہنے ہاتھ کی طرف ایک وسیع اور کشادہ کمرے میں داخل ہوئے جہاں متعدد دام اور عہدہ دار زرق برق لباس میں اپنی کمر میں بگلوس باندھے سروں پر خوش وضع دستاریں رکھے، قیمتی صوفوں اور کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ وہ ہم لوگوں کو دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے اور مصافحے کے لئے اپنی جگہ سے آگے بڑھے۔ اب میں نے ان کی طرف دیکھا۔ اکثر میرے شناسا اور کرم فرما تھے۔ دو چار ہی درباری ایسے نظر آئے جو میرے لئے اجنبی تھے ایک طرف سے فانی اپنی کامیابی پر مسرور آگے بڑھے اور بہت تپاک سے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ فانی کو دیکھ کر فی الجملہ مجھے تسکین ہوئی اور میں انھیں کے پاس صوفے پر بیٹھ گیا۔ اولاً فانی نے مجھے اس خوش بختی پر نہایت خلوص سے مبارک باد دی، پھر باری باری ہر شخص نے رسم تہنیت ادا کی مطلب یہ تھا کہ خوش نصیبی نے تجھے بھی شہزادۂ کیواں حشم کے دربار تک پہنچا دیا، جہاں صرف قسمت کے دھنی ہی پہنچ پاتے ہیں۔ اور فی الحقیقت اس زمانے میں یہ ایسی سرفرازی تھی کہ بہتوں احباب میرے گھر پر آ آ کر مجھے مبارک باد دیا گئے۔ میں اب تک اس بھید سے قطعی بے خبر کہ یہ سب فانی ہی کی کارستانی ہے، میں نے مناسب لفظوں میں ایک ایک کا شکریہ ادا کیا۔ آخر چپکے سے فانی سے پوچھا کہ سرکار نے مجھے کیوں کر یاد فرمایا۔ فانی نے کان پر ہاتھ رکھے کہ مجھے قطعی علم نہیں۔ تم اس محفل کے قابل تھے آخر کب تک الگ الگ رہتے، ایک نہ ایک دن تو یہاں آنا مقدر ہی ہو چکا تھا میں اب تک تنہا تھا، تمہارے آجانے سے مجھے تقویت ہو گی۔ اب لطف رہے گا۔ میں نے اب نظر بھر کے اس خوبصورت کمرے کو دیکھا جو نہایت

قیمتی ساز و سامان سے نئی دلہن کی طرح آراستہ تھا۔ مجھے قرینہ سے وہ آفس روم معلوم ہوا کیوں کہ ایک طرف آفس ٹیبل پر ایک قیمتی لیمپ کے علاوہ لکھنے پڑھنے کا سامان بھی موجود تھا۔ میرے لیے حیران کن بات یہ تھی کہ لیمپ کے علاوہ کوئی دوسری روشنی نظر نہ آتی تھی اور کمرہ بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ جو درباری اس وقت وہاں موجود تھے ان میں قابلِ ذکر ایک نواب الگ جنگ تھے جو بے حشم و خدم کے ایک کم استطاعت امیر تھے۔ ان کو ترکۂ پدری سے دھن دولت برائے نام ہی ہاتھ آئی تھی البتہ ڈائننگ ہال کی کرسیاں بافراط ملی تھیں جنھیں وہ اپنے ڈرائنگ روم میں ایک لمبی قطار کی صورت میں سجائے رہتے تھے۔ ملاقاتیوں کی تعداد چھ سات نفر سے زیادہ نہ ہوگی لیکن کرسیوں کو دیکھ کر گمان ہوتا تھا کہ نصف حیدرآباد کے شرفا صبح و شام ان کے سلام کو ضرور حاضر ہوتے ہوں گے۔

شاعری کی صلاحیت صفر سے زیادہ نہ تھی، یعنی کبھی کبھی ایک آدھ مصرع خود بھی موزوں کر لیتے تھے مگر سنانے کا وہ شوق تھا، جس آفت کے مارے کو موقع سے پا گئے، اس کا دماغ چاٹ گئے۔ دفتر ہو، گھر ہو، کھیل کا میدان ہو، شادی بیاہ کی تقریب ہو، انھیں اپنا اور دوسرے کا وقت ضائع کرنے سے مطلب۔ ایک کہنہ سال، مشاق شاعر کو پچیس روپے ماہانہ تنخواہ دیتے تھے۔ طرح خود تجویز کر دیتے۔ غزل وہ بوڑھا شاعر کہہ دیتا۔ اسی کا کلام اپنے نام سے سناتے پھرتے تھے۔ حافظہ بے شک تعریف کے قابل پایا تھا۔ ہزاروں غزلیں نوکِ زبان تھیں۔ جس کے گھر پہنچ گئے، وہ غریب مصیبت میں مبتلا ہو گیا۔

دوسرے نواب ڈھمک جنگ تھے، جنھیں بخت و اتفاق

نے اونچی کرسی پر ضرور بٹھا دیا تھا مگر شعر کہنے کی صلاحیت ان میں بھی نہ تھی۔ یہ آگرے کی مشہور و معروف غزل ساز فیکٹری کو آرڈر دے کر بہ قیمت غزلیں لکھواتے تھے جنھیں ملٹی کے لفافے کی طرح وی پی کی صورت میں آئے دن وصول کیا کرتے تھے۔ انھیں غزلوں پر حضرتِ نظم طباطبائیؔ سے اصلاح لیتے تھے پھر وہی مالِ غیر اپنا کر دوسروں کو سناتے داد لیتے اور جھک جھک کر سلام کرتے تھے۔ ان میں سیمابیت بہت زیادہ تھی، آگ کے سامنے بے قرار سے رہتے تھے۔

ہم مذاقی کی وجہ سے مجھ سے دونوں سے بے تکلفی کی ملاقات تھی، میں کبھی کبھی ان کے یہاں جاتا تھا اور وہ بھی کبھی میرے یہاں آتے تھے، مگر اس طلسمی کمرے میں مجھے اجنبی سے نظر آئے۔ ملے ضرور، مگر عجیب بے نیازی کے ساتھ، گویا میں ان کا عاشقِ سرگشتہ اور وہ ایک معشوقِ بے پرواہ ہوں۔ نہ آج پہلا سا تپاک تھا، نہ اگلا سا خلوص۔ یہ برتاؤ ان کا مجھے بہت کھلا۔ میں ان کی بے اعتنائی پر پیچ و تاب کھا ہی رہا تھا کہ سامنے کے ریشمی پردے کو ہلکی سی جنبش ہوئی، اور ایک پیکرِ وفا تمکنت نظروں کے سامنے تھا۔ درباری بہ عجلت گھبرا کر کھڑے ہو گئے اور لگے فرشی سلام پر سلام جھاڑنے۔ میرے لئے یہ نیا موقع اور نئی بات تھی، نقالی میں نے بھی کی، مگر حقیقت یہ ہے کہ اس مضحکہ خیز سلام کا حق مجھ سے ادا نہ ہوا۔ میں ہنوز درباری سلام کی مشقت میں مصروف تھا کہ میرے کان میں ایک پرتمکنت اور بارعب آواز گونجی، ”دھمک جنگ! مجھے معاف کرنا آج میں نے تمھیں دیر تک مصروفِ انتظار رکھا، اب بہت جلد تمھیں یاد کرتا ہوں۔“

ڈھمک جنگ نے ہاتھ جوڑ کر عرض کی "سرکار مجھے کوئی زحمت نہیں ہوئی میں تو بہت آرام سے بیٹھا ہوا تھا۔"

اب میرے بھی سات سلام پورے ہو چکے تھے۔ میں جب سیدھا کھڑا ہوا تو سامنے کوئی نہ تھا۔ پرنس واپس جا چکے تھے۔ یہ بات اسی پردے کی خفیف جنبش بتا رہی تھی کہ اُسی دروازے سے سرکار واپس بھی ہو گئے۔ درحقیقت میں نے ایک ہلکی سی جھلک کے علاوہ پرنس کو بالکل نہ دیکھا تھا، فانی البتہ مجھے دھیمی آواز میں یہ شعر سنا رہے تھے۔

ہم نہ کہتے تھے یہ تم سے اے کلیم!
آنکھ بجلی پر نہ ڈالی جائے گی

پرنس نے جس پُر از متانت اور بارُعب لہجہ میں ڈھمک جنگ سے خطاب کیا تھا، اس سے صاف ظاہر تھا کہ بات کرنے والا خاکی انسان ہرگز نہیں بلکہ یہ مافوق البشر قوت کی آواز تھی جو ابھی ابھی کم از کم ساتویں آسمان سے زمین پر اتری ہے۔ اس لب و لہجہ کی یاد نے میرے دل پر پھر ایک اضطرابی کیفیت طاری کر دی کیونکہ ہنوز میری پیشی باقی تھی اور میری باریابی کی ابھی نوبت نہ آئی تھی۔

میں ان تفصیلات میں محض اس لئے جا رہا ہوں کہ جن لوگوں نے شاہی دربار آنکھوں سے نہیں دیکھے ان کو میرے بیان ہی سے دربار اور آداب دربار کی ایک جھلک نظر آجائے کیونکہ یہ آخری دربار بھی جس کا ذکر میں کر رہا ہوں ہمیشہ کے لئے ختم ہو چکا اور اب دیکھنے والوں کے لئے میرے بیان کے علاوہ کچھ باقی نہیں رہا۔ آنے والی نسلیں کیا جانیں گی کہ سلاطین اور شاہزادوں کے دربار کا کیا

رنگ تھا۔

تقدیر نے جس دربار میں مجھے پہنچایا تھا اس کے ٹھاٹ باٹ کے آگے دربار شاہی اور ولی عہد کے دربار دونوں ہیچ تھے۔ دکن میں تنہا یہی ایک دربار تھا جس کا لطف پہلے جوشؔ نے، پھر فانیؔ نے یا میں نے جی بھر کے اٹھایا اور اتنا اٹھایا کہ طبیعت چھک گئی۔ اب نہ کوئی امیر مجھے امیر نظر آتا ہے نہ کوئی دربار دُربار معلوم ہوتا ہے۔

ایک بوڑھے درباری جو بہ عجلت سات سلام نہ کر سکے تھے وہ اب تک پردے کے سامنے سلام پہ سلام کر رہے تھے۔

تھوڑی دیر میں ایک ماہ پیکر پری چہرہ لڑکے نے جو درباری لباس میں ملبوس تھا آ کر بہ آواز بلند اطلاع دی کہ سرکار خاصے کی میز پر تشریف لے آئے۔ آپ لوگوں کو یاد فرما رہے ہیں۔ سب لوگ آداب اور سلیقے سے ڈائننگ روم میں داخل ہو گئے۔ میں اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ ایک منٹ کے اندر اسی خوب رو خادم نے واپس آکر مجھ سے کہا کہ آپ بھی چلئے، آپ سب کے ساتھ کیوں نہیں گئے۔ میں نے محسوس کیا کہ زبان یاری نہیں کرتی۔ بہ وقت صرف یہ کہہ سکا کہ میرے پاس درباری لباس نہیں۔ سرکار کے سامنے کیوں کر حاضر ہوں۔ میرے جواب پر وہ مسکراتا ہوا اندر چلا گیا۔ پھر فوراً ہی واپس آکر کہنے لگا کہ سرکار کا حکم ہے کہ آپ ٹوپی اتار کر آجائیے آپ کو اجازت ہے۔

اس وقت کے بعد میں نے سینکڑوں مرتبہ اپنے اس اضطرار و لکنت پر تنہائی میں غور کیا ہے کہ آخر میری زبان مجھ سے بغاوت پر کیوں آمادہ ہو گئی تھی۔ آیا وہ رُعب دربار تھا یا رُعبِ حسن جس نے زبان میں

لرزش اور پاوں میں لغزش پیدا کر دی گئی۔ مگر وہ عقدہ جوں کا توں آج تک لاینحل ہے۔

جس افسردگی کے ساتھ وہ قیدی جسے پہلی بار سزا کا حکم سُنا گیا ہو جیل کے اندر قدم رکھتا ہے اسی بے دلی کے ساتھ میں نے ڈائننگ روم میں قدم رکھا۔ روشنی کی کثرت سے دن کا عالم تھا۔ مگر یہاں بھی کوئی لیمپ یا بلب مجھے روشن نظر نہ آیا۔

صدر میں جونیر پرنس اپنی کرسی پر شاہانہ وقار سے رونق افروز تھے۔ سامنا ہوتے ہی میں نے سات سلام کئے۔ جس کا جواب ایک خفیف سی جنبش سر تھی۔ پرنس نے فرمایا آؤ فانی کے پاس بیٹھو، داہنے ہاتھ کی طرف۔ تیسری کرسی پر فانی بیٹھے تھے۔ چوتھی خالی تھی۔ کرسی کے پاس پہنچ کر میں ایک مرتبہ پھر آداب بجا لایا اور سلیقے کے ساتھ اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ ڈنر کی سروس اب شروع ہوئی۔ پہلی ڈش پستئی رنگ کے سوپ کی تھی۔ پہلے شاہزادے نے چمچے سے سوپ پینا شروع کر دیا۔ ان کے بعد درباریوں نے پیروی کی۔ ڈنر کی میز نہایت نفیس اور بیش قیمت تھی۔ یہی حال چھریوں کانٹوں اور پلیٹوں کا تھا۔ جن کھانوں کی سروس ہو رہی تھی وہ بھی اے کلاس کے تھے۔ پورا کمرہ مشک و زعفران کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ میز کے بیچ میں تازہ میوے اور پھل اس کثرت سے خوبصورت طشتریوں میں دھرے تھے کہ میز پھلوں اور میووں کی دکان معلوم ہوتی تھی۔ کھانا کھانے میں پرنس جس امیر یا مصاحب کی طرف متوجہ ہوتے وہ کانٹا چھری چھوڑ کر ہاتھ جوڑ لیتا اور دست بستہ ان کی بات کا

جواب دیتا۔ مصاحبوں کا یہ طرزِ عمل میرے لیے ایک طرح کا سبق تھا جسے میں بہ غور دیکھ رہا تھا۔ پرنس ایک نوالہ منہ میں رکھتے تو دس منٹ باتیں کرتے جس سے خطاب کرتے وہ دست بستہ بجا اور درست کہتا رہتا مگر فوراً ہی دوسرے سے مخاطب ہو جاتے تاکہ ہر شخص آزادی سے کھانا کھا سکے۔ اس موقعے سے فائدہ اٹھا کر میں نے پرنس کو اچھی طرح دیکھا۔ نہایت خوبصورت، نازک اندام، شریف اور شائستہ معلوم ہوئے۔ پرنس بھی گہری نظروں سے میری طرف دیکھتے تھے۔ میں اس وقت اپنی پلیٹ اور کھانے کی طرف متوجہ رہتا تھا۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ انھوں نے میرے متعلق کیا رائے قائم کی۔ مگر میرا فیصلہ اپنی جگہ یہ تھا کہ ایسے خوبصورت اور شائستہ شاہزادے کی مصاحبت میں مضائقہ نہیں۔

میرے سے کچھ فاصلے پر کم و بیش ایک درجن پری چہرہ، قمر طلعت خدم پانی پلانے کے لئے کھڑے تھے جو ہر شخص کے اشارے پر اسے پانی پیش کرتے تھے۔ میں ان کے حسن و جمال کو دیکھ کر دنگ تھا کہ ایسے ماہ جبیں، ناز آفریں لڑکے پرنس کو بہ یک وقت کہاں سے دستیاب ہوئے ہوں گے۔ بعد کو معلوم ہوا کہ کوتوالِ شہر نے تجسس بسیار کے بعد ان کو مہیا کیا تھا۔

بریانی کا نوالہ منہ میں رکھا تو منہ گھی سے بھر گیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کامل الفن باورچی نے ایک ایک چاول کا پیٹ گھی سے بھر دیا ہے۔ ایک ایک ڈش کی تفصیل کہاں تک بیان کروں۔

آخری ڈش بالائی اور لوز کی تھی۔ بالائی کے چھوٹے چھوٹے تھال جن میں کم و بیش تین تین سیر بالائی بھی تھی۔ ہر شخص کے سامنے آتے تھے۔ ہر شخص اپنی مرضی کے مطابق ایک یا دو چمچے بالائی نکال لیتا تھا۔ دوسری ڈش لوز کی ہوتی تھی، جس میں بادام اور پستے کے لوز ہوتے تھے۔ انھیں لوزوں کے ساتھ بالائی کھانے کا دستور تھا۔ بالائی کا دل کم از کم چار انگل ہوتا تھا۔ اس کے لطف ولذت کا اندازہ ناظرین کو اس انکشاف سے ہو سکتا ہے کہ جن بھینسوں کے دودھ سے وہ بالائی جمائی جاتی تھی اُن کو صبح شام بادام اور پستے کھلائے جاتے تھے۔ مقصود یہ تھا کہ دودھ کی لطافت بڑھ جائے میں نے بالائی کے تھالوں کا شمار کیا تو گیارہ تھال تھے۔ جن کی سروس اس ڈنر میں ہوئی۔ لکھنؤ کی بالائی جو میں نے اودھ کے روسا کے دسترخوان پر کھائی تھی اور جس کی میری نگاہ میں بڑی قدرومنزلت تھی اُس دن نظروں سے گر گئی۔

بارے کامل ایک گھنٹے میں ڈنر ختم ہوا۔ پہلے شاہزادے والاشان نے ہاتھ دھوئے۔ پھر ہم سب کے ہاتھ دھلائے گئے۔ خاص خاص مصاحبوں کو خاصے کی ایک ایک گلوری اور ایک ایک قیمتی سگریٹ خدام نے پیش کیا۔ اس عنایت خاص سے میں بھی سرفراز ہوا۔ اس کے بعد پرنس اٹھ کھڑے ہوئے اور مجمع منتشر ہو گیا۔

اب فانی مجھے اپنے ساتھ محل کے باہر لے آئے اور کہا "آؤ، تھوڑی دیر چہل قدمی کر لیں۔ اس کے بعد دربار کی مشقت کا سامنا کرنا ہے۔" چہل قدمی میں فانی نے مجھے نصیحت کی، خبردار ان درباریوں سے

دل کی بات کبھی نہ کہنا۔ یہ سب کے سب منافق ہیں، دوستی کے پردے میں دشمنی ان کا خاص شیوہ اور شعار رہا۔ یہاں ہر شخص کو اپنا بدخواہ جاننا وغیرہ وغیرہ۔

کم و بیش آدھ گھنٹے ٹہلنے کے بعد فانی نے گھڑی دیکھی، اور کہا آؤ اب اندر چلیں، دربار کا وقت آگیا۔ اس مرتبہ فانی مجھے محل کی بائیں طرف لے گئے۔ ادھر بھی پہلے ایک گیلری تھی، جس میں قیمتی کرسیاں جا بہ جا بچھی ہوئی تھیں۔ گیلری کے سامنے نہایت وسیع ایک ہال تھا جو روشنی سے جگمگا رہا تھا۔ ہم لوگ گیلری میں ایک جگہ بیٹھ گئے، یہیں اس وقت سب مصاحب جمع تھے۔ ٹھیک ساڑھے دس بجے پرنس برآمد ہوئے۔ سب لوگ اٹھ اٹھ کر آداب شاہانہ بجا لائے پرنس نے خفیف سی جنبش سر سے سب کے سلاموں کا جواب دیا اور تیز قدم چل کر ہال میں داخل ہو گئے۔ مصاحب پھر اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

دس منٹ کے بعد ہال سے آواز آئی "ڈھمک جنگ با" ڈھمک جنگ "یس سر" کہتے ہوئے ہال کی طرف دوڑے۔ سامنے پہنچ کر درباری آداب بجا لائے۔ حکم ہوا کہ اپنی جگہ بیٹھو۔ اس سرفرازی پر انھوں نے پھر سات سلام کئے۔ اب ٹھک جنگ کی پکار ہوئی، اور اسی طرح وہ بھی سلاموں کی ورزش کرتے ہوئے ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ چوتھے نمبر پر فانی کی باری تھی۔ فانی کو حکم ملا صدق کو بھی اپنے ساتھ لاؤ۔ ہم لوگ ایک ساتھ باریاب ہوئے۔ پرنس صدر میں جلوہ افروز تھے۔ داہنے ہاتھ کے پہلے صوفے

پر ایک جنگ اور ڈھمک جنگ بیٹھے تھے۔ بائیں ہاتھ کے پہلے صوفے پر نواب
کے برابر مجھے جگہ ملی۔ اس وقت ایک جنگ اور ڈھمک جنگ کا اندازِ نشست
دیکھنے کے قابل تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ گویا زیرِ عرش بیٹھے ہیں۔ دربار
جمتے جمتے رات کے گیارہ بج گئے۔ دونوں قطاروں میں کوئی ۲۵ یا ۲۷
مصاحب ہوں گے۔

جب تک دربار جمے جمے، میں اس ہال کے جائزے میں مصروف
رہا جو قابلِ دید اور نہایت بیش قیمت فرنیچر سے آراستہ تھا۔ صوفوں
اور کرسیوں کے پائے چاندی کے تھے۔ انھیں صوفوں کے ساتھ ایک
کرسی صدر میں بچھی ہوئی تھی، جس پر خود پرنس جلوہ افروز تھے۔ مصاحبوں
کی دونوں صفوں میں دو دو رفیقوں کے درمیان، بہت بڑے چاندی
کے اگالدان رکھے ہوئے تھے جو ایسے پاک و صاف تھے گویا ابھی ابھی
دکان سے آئے ہیں۔ اسی التزام کے ساتھ ایک ایک گول میز بھی
تھی جس پر ۵۵۵ نمبر کے سگریٹ کا ایک ایک ٹین تازہ کھلا ہوا
رکھا تھا۔ کمروں کی دیواروں پر مختلف نفیس رنگوں سے ایسے
خوبصورت نقش و نگار بنے ہوئے تھے جیسے اس سے پہلے میں نے
کبھی نہ دیکھے تھے۔ نہ شاید اب کبھی دیکھ سکوں۔ ہال میں بڑے
قالین بچھا ہوا تھا، معلوم ہوا کہ وہ بھی سات ہزار میں یورپ
سے خریدا گیا تھا۔ جو رنگ دیواروں کا تھا اسی رنگ کے نہایت
قیمتی اور ریشمی پردے ہر در پر بہت ہی خوبصورت اسٹینڈ
پر پڑے ہوئے تھے۔ پرنس کی بائیں طرف ایک گول میز پر جو آئینے
کی طرح چمک رہی تھی ایک نہایت قیمتی ٹائم پیس اور ایک خوبصورت

آئینہ دھرا تھا جس کے پاس ہی ایک خوبصورت کنگھا بھی تھا۔
ہال کی چھت میں دو بڑے بجلی کے پنکھے ہلکی رفتار سے چل رہے
تھے، تاکہ کمرے کی ہوا صاف رہے ورنہ سردی کا موسم تھا پنکھوں کی
ضرورت نہ تھی جب پنکھوں کی ہوا سے پرنس کے سر کا کوئی بال جگہ
سے بے جگہ ہو جاتا تو کنگھا اٹھا کر درست کر لیتے۔ اس عمل کے بعد
ہی خدام تسلا، لوٹا اور صابن لے کر دوڑتے، پرنس صابن سے دونوں
ہاتھ دھوتے۔ ایک خادم نہایت اُجلا تولیہ پیش کرتا اس سے ہاتھ
کا پانی خشک کرتے۔ اب یہ تولیہ میلے کپڑوں میں پھینک دیا جاتا
اس طرح رات بھر میں دس بارہ تولیے میلے کپڑوں میں پھینک جاتے۔ میں
اس نفاست پر دنگ تھا اور دل میں کہتا تھا کہ ہندوستانی شاعروں
کے محبوب اگر یہ قیمتی اور میلے تولیے پا جائیں تو کم از کم ایک ہفتہ
انھیں سے اپنا منہ پوچھیں۔ مگر ان کے نصیب ایسے کہاں کہ یہ بیش قیمت
تولیے ان کو ملیں۔ البتہ پرنس کا دھوبی اور دھوبن ان کے بال بچے دو چار
دن ضرور ان کو استعمال کرتے ہونگے۔

غرض وہاں کی ہر شے میں ایسی نفاست تھی اور دربار میں
عیش و تموّل کے ایسے سامان مہیا تھے جو اودھ کے راجا مہا راجا
کے یہاں میں نے کسی بڑی سے بڑی تقریب میں بھی نہ دیکھے تھے
الف لیلہ کے قصے جنھیں کبھی میں نے کتابوں میں پڑھا تھا آج بیداری
کے عالم میں میری نظروں کے سامنے تھے۔

روشنی کا یہ انتظام تھا کہ ہال کے چاروں طرف چھت
سے متصل کارنس پر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بجلی کے بہت تیز بلب

ایک قطار میں اس طرح نصب تھے کہ ان کا منہ چھت کی طرف تھا، وہ اپنی روشنی چھت پر پھینکتے تھے، چھت سے چھن کر وہ روشنی فرش پر آتی تھی۔ اگر ایک سوئی بھی پڑی ہوتی تو صاف نظر آجاتی۔ ہال کے چاروں کونوں میں بڑے بڑے چار خوش نما ڈیوٹ رکھے تھے۔ ان کے اندر بھی بہت تیز بلب نصب تھے۔ وہ بھی اپنی روشنی چھت کے چاروں کونوں پر پھینکتے تھے، معلوم ہوا کہ یہ ڈیوٹ بھی نہایت بیش قیمت تھے۔ اس روشنی میں پرنس کا خوب صورت چہرہ چودھویں کے چاند کی طرح چمک رہا تھا۔ رعب کا یہ عالم کہ کوئی نظر اٹھا کر ادھر دیکھنے کی جرأت نہ کرتا تھا۔

داہنے ہاتھ کی صف میں مجھے ایک سیم تن نازک بدن لڑکا بھی مصاحبوں کی قطار میں بیٹھا نظر آیا۔ فانی نے آہستہ سے بتایا کہ یہ لڑکا ہندو ہے اور نرت کرنے میں کمال رکھتا ہے۔ تم ابھی اس کا کمال دیکھو گے۔

اس عرصہ میں دربار بھی نوک پلک سے ٹھیک ہو چکا تھا۔ پرنس نے پہلے اسی لڑکے کو آواز دی۔ لڑکا اٹھ کر آداب بجالایا اور کرسی پر جا کر بیٹھا جو پرنس کی کرسی کے بالمقابل ہال کے دوسرے کونے پر بچھی ہوئی تھی۔ اس چوکی پر بھی ایک خوشنما اور قیمتی قالین کا فرش تھا۔ لڑکے کے دائیں معز اور بائیں ہندو بیٹھ گئے۔ ہندو اس دربار میں طبلہ بجاتے تھے، اور اس فن میں استادانہ مہارت رکھتے تھے۔ معز کے سامنے ہارمونیم رکھا گیا۔ اشارہ پاتے ہی ساز بجنے لگا اور لڑکے نے نرت شروع کر دی۔

فانی نے میرے کان میں کہا یہ سب کے سب تعلیم یافتہ ہیں۔ ذاتی شوق کی بنا پر یہ فنون سیکھے ہیں۔ کچھ ہی دیر میں مجھے معلوم ہو گیا کہ حقیقت میں سب کے سب باکمال ہیں۔ ان میں نو آموز کوئی نہیں۔

دربار میں ہر شخص کی نظر اسی ماہ وش لڑکے پر تھی، جو نرت کے کمالات دکھا رہا تھا۔ پرنس موقع موقع سے تعریف و توصیف سے اس کی ہمت افزائی کرتے جاتے تھے۔ ان تحسین و آفرین پر مَک جنگ اور ڈھمک جنگ اپنے اپنے صوفوں پر علحدہ اچھل کود کر رہے تھے۔ میرے لئے ان کا بھی ایک تماشا تھا، جو اُس لڑکے کے تماشے سے کسی طرح کم نہ تھا۔ شاید پوری محفل میں ہم دو ہی آدمی (میں اور فانی) اس میں کورے تھے۔ مجھے اتنا احساس ضرور تھا کہ محفل میں ایک محبوب خوب رونازِ معشوقانہ دکھا رہا ہے۔ تقریباً پون گھنٹے لڑکے نے نرت کی ہوگی کہ پسینے پسینے ہو گیا۔ پرنس نے ہاتھ سے ٹھہرنے کا اشارہ کیا۔ اس اشارہ پر ساز اور نرت دونوں موقوف ہو گئے۔ لڑکے پر ہر طرف سے تحسین و آفرین کے پھول برسنے لگے۔ سب سے زیادہ پرنس نے اظہارِ پسندیدگی فرمایا۔ لڑکا اٹھ کر آداب بجالایا، پھر چوکی سے اتر کر ادب سے اپنی کرسی پر جا بیٹھا۔

اب معززین کے سامنے ایک نہایت خوبصورت اسٹینڈ پر پرنس کا قلمی دیوان لگا دیا تھا۔ ساز پھر بجنے لگا۔ تم سامنے والی صف سے جدھر مک جنگ اور ڈھمک جنگ کی نشست تھی اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے پاس آئے اور سرگوشی کے لہجے میں مجھ سے کہا، اب مشاعرہ شروع ہوتا ہے، تم تکلف نہ کرنا، بلکہ کمالِ بے تکلفی

سے پرنس کے کلام کی تعریف کرنا۔ میں نے سر کے اشارہ سے اقرار کیا۔ اُدھر طبلے کی تھاپ اور ہارمونیم کی ساز پر معز نے سرکار کی غزل کا پہلا مصرع گایا۔ پہلے ہی مصرع پر فانی نے اس انداز سے تڑپ کر توبہ کہا اور زانوں پر اس بے تابی سے ہاتھ مارا گویا بچھو نے ان کے زانو پر ڈنک مار دیا ہو۔ دوسرے مصرع پر تو قیامت برپا ہو گئی۔ الک جنگ اور ڈھمک جنگ نے "ارے سبحان اللہ" کا فلک شگاف نعرہ مارا اور دونوں کے دونوں اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ الک جنگ ہاتھ جوڑ کر" اس مطلعے کا جواب نہیں ہے مالک" ڈھمک جنگ دست بستہ" اردو ادب میں ایک بیش بہا اضافہ ہے خداوند"۔ فانی" مطلع نہیں مطلع آفتاب ہے سرکار!"
غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ ہر مصاحب مجھے اس کوشش میں نظر آیا کہ وہ کوئی ایسی بات کہدے جس کے آگے تعریف و توصیف کی حد ہی ختم ہو جائے۔

میں ہکا بکا ایک ایک کا منہ دیکھ رہا تھا۔ خصوصیت کے ساتھ الک جنگ اور ڈھمک جنگ کو جن پر ایسی وحشت طاری تھی، گویا عن قریب یہ لوگ اپنے اپنے لباس پھاڑ کر جنگل کی راہ لیں گے اور پھر کبھی ہوش میں نہ آئیں گے۔ فانی کو دیکھا تو وہ بھی سر ٹکرانے پر آمادہ نظر آئے۔ میں ڈرا کہ کہیں میرے ہی سر سے اپنا سر نہ ٹکرائیں۔ غرض ایک ہی مطلع بار بار گایا جانے لگا۔ مصاحبوں نے توصیف کے پُل باندھ دیے۔ ایک کہتا میر کی روح وجد میں آ گئی ہو گی۔ دوسرا کہتا سودا اپنی قبر میں اٹھ کر بیٹھ گئے ہوں گے۔

سرکار نے غضب کیا کیا مطلع ارشاد فرمایا ہے۔ صلِّ علیٰ اصلِّ علیٰ!
ایک رفیق نے ہانک لگائی "ایں سعادت بہ زورِ بازو نیست" دوسرے
نے غل مچا کر دوسرا مصرع پڑھ دیا۔ "تا نہ بخشد خدائے بخشندہ۔"
میرے لیے اس قسم کی محفل مشاعرہ میں شریک ہونے کا
پہلا موقع تھا۔ میں دم بخود کہ الٰہی اس محفل میں میرا کیا حشر
ہونا ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ معز سے خوش گلو میں نے کم
دیکھے ہیں۔ وہ شخص گاتا تھا یا جادو کرتا تھا۔ کیا رسیلی اور میٹھی
آواز تھی، اور آواز پر اسے کس قدر قابو حاصل تھا۔ خدا خدا کر کے
مطلع کا اثر کم ہوا۔ ایک جنگ اور ڈھمک جنگ کسی قدر ہوش
میں آئے۔ معز نے حسنِ مطلع گایا۔ اس وقت اتفاق سے ڈھمک
جنگ نے اپنا قیمتی سگار منہ سے نکال کر انگلیوں میں دبا لیا تھا۔
وہ دراصل دوسرے شعر کی داد دینے کی تیاری میں تھے کہ ایک جنگ
نے ان سے پہلے ناتمام ہی شعر پر "سبحان اللہ" کہہ کر اپنا ہاتھ
جو پھینکا وہ ڈھمک جنگ کے اسی ہاتھ سے ٹکرا گیا جس کی انگلیوں
میں وہ سگار دبائے ہوئے تھے۔ اور سگار ان کی انگلیوں سے چھوٹ
کر ٹپ سے اگال دان میں جا گرا۔ جس بے کسی کی نظر سے ڈھمک
جنگ نے اس کی طرف دیکھا، اسے میں مدت العمر نہ بھولوں گا۔
مجھے قطعی یہ خیال نہ رہا کہ میں پرنس کی محفل میں ہوں اور
کھل کھلا کر ہنسنے لگا۔ خیریت گزری کہ اس شور و غل میں جو دوسرے
شعر پر محفل میں برپا تھا، کسی نے میری طرف توجہ نہیں کی، ورنہ
محفل ہی سے نکال دیا جاتا۔

ڈھمک جنگ کی بے کسا نہ نظر کا منشا یہ تھا کہ آداب دربار
کے مطابق جب تک مشاعرے میں انڑول نہ ہو وہ دوسرا سگار
نہ جلا سکتے تھے، اور انٹرول کو ابھی بہت دیر تھی۔ اس لیے اب
انہیں محفل میں صبر و شکر کے ساتھ بے سگار گھنٹہ دو گھنٹے بیٹھنا
پڑے گا۔

مُعز غزل پر غزل گاتے جاتے تھے۔ میں اس ساز اور مُعز
کی آواز سے مسحور سا اپنی جگہ بیٹھا تھا۔ پرنس کا ہر شعر تعریف
کے قابل تھا، مگر میرے منہ سے اب تک کوئی توصیفی جملہ اس لیے
نہ نکل سکا تھا کہ مصاحبوں کے اس شورِ توصیف میں مجھے کوئی نئی
بات ہی نہ سوجھی تھی۔

شاید پانچویں یا چھٹی غزل کے ردیف و قافیے یہ تھے
"نظر کیوں نہیں جاتے" اثر کیوں نہیں جاتے" گاتے گاتے مُعز نے
یہ شعر شروع کیا ؎

وعدے کا بھی اقرار ہے آنے سے بھی انکار
وعدے ہی سے تم اپنے مگر کیوں نہیں جاتے

مُعز نے دوسرے مصرعے کو آدھا ہی گایا تھا کہ شام صاحب
اگر وہی جو اس شام کو اعتدال سے زیادہ سرخوش تھے، یکایک
اٹھ کھڑے ہوئے اور "گزر کیوں نہیں جاتے سے" مصرع پورا
کر کے لگے تعریف کرنے۔ ہاتھ جوڑ کر "کیا شعر فرمایا ہے مالک
جس کی تعریف نہیں ہو سکتی" "وعدے ہی سے تم اپنے گزر کیوں نہیں
جاتے" اے سبحان اللہ سبحان اللہ! کیا قافیہ نظم فرما دیا ہے۔ خداوند

جس کا جواب نہیں"۔ پرنس اس بے تکی ہانک پر خوش دلی سے ہنسنے لگے۔ مجھ سے فرمایا، صَدَق تم صحیح مصرع شیام کو بتا دو۔ میں نے بلند آواز سے صحیح مصرع دہرایا۔ مگر شیام صاحب کے ہوش ہی کب بجا تھے، وہ "مگر" کو اب کی "اگر" سمجھے اور ہاتھ جوڑ کر پھر کھڑے ہو گئے، کہنے لگے "سبحان اللہ، سبحان اللہ"۔ وعدے ہی سے تم اپنے مگر کیوں نہیں جاتے۔ نیا قافیہ نظم فرما دیا ہے مالک۔ غلام نے ایسا مگر آج تک نہ دیکھا تھا"۔ اب کی پرانس کے ساتھ سب درباری ہنسنے لگے۔ حکم ہوا ان کو باہر لے جاؤ۔ انھیں تازہ ہوا کی ضرورت ہے۔ اشارے پر راز موقوف ہو گیا۔ دو مصاحبوں نے شیام صاحب کو محفل سے اٹھا کر خدّام کے سپرد کیا۔

حکم ہوا، کافی لاؤ۔ میں نے گھڑی دیکھی، ایک بجا تھا فانی نے جیب سے ڈبیا نکال کر پان کھایا۔ ڈھمک جنگ نے دوسرا سگار سلگایا۔ ماہ طلعت خدّام نے پہلے پرنس کے سامنے پیالی رکھی پھر ہم سب کے سامنے پیالیاں آئیں۔ ایسی بیش قیمت اور حسین پیالیاں تھیں کہ ان کے رنگ روپ ہی نے کافی ہی اشتہا پیدا کر دی تھی۔ ہوائی سشت کے ترشے ہوئے دو خوبصورت ٹکڑے ایک خادم نے میری پیالی میں ڈالے۔ ایسی خوش ذائقہ کافی تھی کہ سبحان اللہ۔ دودھ بھی انھیں بھینسوں کا تھا جن کو بادام اور پستے کھلائے جاتے تھے۔ کافی پی کر پرنس محل میں تشریف لے گئے فانی تم سیدھی کیے بیٹھے کی غرض سے پاؤں پھیلا کر صوفے پر بیٹھے۔ میں بھی بے تکلفی سے بیٹھ گیا۔ فانی کہنے لگے۔ تم بھی کمر سیدھی کر لو۔

آدھے گھنٹے کی یہ مہلت غنیمت ہے۔ اس کے بعد دوسری نشست ہوگی، جو تین بجے شب کو ختم ہوگی۔"

اس وقفے سے ہر درباری نے اپنی اپنی ضرورت کے مطابق فائدہ اٹھایا۔ فانی اپنی کمر سیدھی کرنے میں مصروف تھے۔ امک جنگ اور ڈھمک جنگ باتھ روم کی طرف بھاگے بعض نے منہ ہاتھ دھوئے کہ نیند قریب نہ آنے پائے۔ معز اور بسند دوسرے کمرے میں جاکر فرش پر لیٹ رہے۔ اس طفلِ ماہ رخسار نے جس نے رزرت کے کمالات دکھائے تھے جیب سے کنگھا نکال کر زلفیں سنواریں میں نے تکان دور کرنے کے لیے ایک سگریٹ جلایا۔ فانی آہستہ آہستہ مجھ سے باتیں کیے جا رہے تھے۔ تقریباً ۴۵ منٹ کے بعد پرنس بھی ہاتھ منہ دھوکر واپس آئے۔ سب درباری اٹھ کر آداب بجالائے۔ معز اور بسند کی پکار ہوئی ساز پھر بجنے لگا اور مشاعرے کی دوسری نشست شروع ہوئی۔

پھر وہی ہنگامہ جس کا ذکر اوپر آچکا ہے دوبارہ شروع ہوا۔ سرکار کے ایک ایک شعر پر درباری سر دھنتے تھے تعریف میں ہر شخص ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش میں مصروف تھا۔ معز الاپ رہے تھے۔ میں نے اس نشست میں ایک معزز لیور پین کو بھی دیکھا جو میرے سامنے والی صف میں کرسی پر تصویر کی طرح خاموش بیٹھا تھا اور امک جنگ اور ڈھمک جنگ کی سینہ کوبی اور جامعہ دری کو بہ نگاہِ حیرت دیکھ رہا تھا۔ نانی نے بتایا کہ یہ اسٹاف سرجن ہے۔ رات کی حاضری اس

کی ڈیوٹی میں داخل ہے۔ پندرہ سو ماہانہ تنخواہ پاتا ہے۔ صبح کو جب پرنس آرام فرماتے ہیں تو اس کی ڈیوٹی ختم ہوتی ہے۔

چار یا پانچ غزلوں میں تین بج گئے۔ پرنس کے اشارے پر ساز موقوف ہوا۔ معزز اور ہند وچوکی سے اتر کر اپنی اپنی جگہ بیٹھے۔ حکم ہوا ہماری دوا لاؤ۔ ایک خادم نے ایک شیشی لاکر پیش کی۔ شیشی سے دو گولیاں نکال کر پرنس نے خود کھائیں، دو گولیاں نجم کو عنایت ہوئیں۔ پانی کے ایک گھونٹ سے نجم نے بھی حلق کے نیچے اتاریں۔

اب پرنس کھڑے ہو گئے، سب درباری اٹھ کھڑے ہوئے حکم ہوا فانی اب تم جا کر آرام کرو۔ صدق کو ان کے گھر پر چھوڑ دینا بہت خوب کہہ کر فانی آداب بجا لائے، میں نے بھی سلام رخصت کیا۔ خدا حافظ کہہ کر پرنس خواب گاہ کی طرف تشریف لے گئے۔ اعزازی مصاحبوں نے جواباً خدا حافظ کہا۔ میں نے اور فانی نے ایک ایک سگریٹ جلایا۔ الک جنگ اور ڈھک جنگ سے رخصتی مصافحہ کیا، اور دربار ہال سے باہر نکلے۔ ہل فورٹ کے صحن میں جہاں میں نجم کے ساتھ آکر اترا تھا، اس وقت بیسیوں سرکاری موٹریں کھڑی تھیں۔ ڈرائیور اپنی موٹروں پر پڑے سو رہے تھے۔ خدام نے ڈرائیوروں کو جگایا۔ باری باری لوگ سوار ہونے لگے۔ تیسری یا چوتھی موٹر پر فانی کے ساتھ میں بیٹھا۔ موٹر چلی تو میں نے اطمینان کی سانس لی۔

اب میں نے فانی سے دریافت کیا: نجم کیا دوسری موٹر

پر چلے گئے؟" فانی نے ہنس کر کہا "ہم تو اعزازی مصاحب تھے۔ اس لئے
چھوٹ گئے۔ وہ پیڈ درباری ہیں چھ بجے صبح تک ان کی ڈیوٹی ہے۔"
میں نے پوچھا "سرکار نے تو آرام فرمایا اب نجم یہاں رہ کر کیا کریں گے؟" فانی
نے بتایا کہ "اب سرکار اپنی مسہری پر لیٹے ہوں گے۔ مسہری کے پاس
کرسیوں پر جتنے پیڈ درباری ہیں بیٹھ کر ان سے باتیں کریں گے۔ ٹھیک
چھ بجے جب پرنس سو جائیں گے تو وہ لوگ اپنے اپنے گھر جائیں گے۔
مجھے اس جگہ یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ نجم آفندی کے سپرد پرنس کے کلام کی
اصلاح تھی۔ تنخواہ وہ اسی کام کی پاتے تھے۔ مصاحبت فانی کی طرح اُن کی
بھی اعزازی ہی تھی' مگر تقرب کی وجہ سے سائے کی طرح پرنس کے ساتھ
ساتھ رہنے پر مجبور رہتے تھے۔

میں نے اس تقرب پر دل ہی دل میں خدا سے پناہ مانگی۔ پھر فانی
سے پوچھا کہ یہ دوا جو تین بجے پرنس نے کھائی اور نجم کو بھی کھلائی' کس مرض
کی دوا تھی' کیا شاگرد اور اُستاد دونوں ایک ہی مرض میں مبتلا ہیں؟ اس
سوال پر فانی خوب جی کھول کر ہنسے اور کہا "تم ایک ہی رات میں یہاں کے
سب راز معلوم کرنا چاہتے ہو۔ یہاں تہ بہ تہ راز ہیں جن کو معلوم کرنے کے
لئے ایک عمر چاہیئے' میں دس برس سے اسی مشقت میں مبتلا ہوں' اور
آج تک کل اسرار سے واقف نہ ہو سکا۔ اچھا سنو! جو گولیاں پرنس نے
کھائیں' وہ جرمنی کی ایجاد ہے۔ 'فانا ڈوم' اس کا نام ہے۔ خواب آور
دوا ہے۔ مگر اس بلا کی دوا ہے کہ اگر اس کی ایک گولی پہلے پہل کسی ہٹے کٹے
شخص کو کھلا دو تو وہ ۲۴ گھنٹے تک اپنے بستر پر مردے کی طرح پڑا
رہے۔ لاکھ جھنجوڑو' لاکھ چیخو' چلاؤ' مگر کسی طرح اس عرصہ سے پہلے وہ

جاگ نہیں سکتا۔ میں نے گھبرا کر کہا سرکار نے تو دو گولیاں کھائی تھیں اور تنجم کو بھی دو ہی گولیاں کھلائی تھیں۔ فانی نے کہا یہ صحیح ہے۔ سرکار کا معاملہ یہ ہے کہ مدت سے جاگتے جاگتے ان کی نیند غائب ہو گئی ہے۔ ان پر دو گیاں اپنا پورا اثر نہیں کرتیں۔ تین بجے دو گولیاں کھاتے ہیں تو چھ بجے نیند آتی ہے۔

یہی صورت تنجم کی ہے۔ وہ بھی اس دوا کے بغیر سو نہیں سکتے۔ یہ سن کر مجھے اپنے بدن میں کپکپی سی محسوس ہوئی۔ پھر میں نے کوئی سوال نہیں کیا۔ اتنے میں میرا گھر بھی آ گیا اور میں فانی سے 'خدا حافظ' کہہ کر گھر کے اندر گیا۔ پلنگ پر لیٹ کر گھڑی دیکھی تو ٹھیک چار بجے تھے۔ ساڑھے چار کے قریب نیند آئی تو دس بجے دن کو آنکھ کھلی۔

دربار کی دوسری رات

رات بھر کی بیداری اور تکان دربار سے ایک ایک رگ دکھ رہی تھی۔ حسن اتفاق کہ وہ دن تعطیل کا تھا۔ میں نے بستر سے اٹھ کر باطمینان ہاتھ منہ دھویا، غسل کر کے لباس تبدیل کیا۔ ناشتہ کرنے بیٹھا تو دن کے گیارہ بجے تھے۔ خمارِ دربار کا تقاضا تو یہ تھا کہ پھر لیٹ رہوں، مگر میں نے چائے کی دو پیالیوں سے جسم میں چستی پیدا کی۔ پان کی ڈبیا جیب میں رکھی اور سواری منگوا کر سیدھا چوک پہنچا۔ چاندی والوں کی دوکان سے میں نے ایک نہایت خوبصورت بگلوس خریدا۔ پھر پوچھتا پوچھتا دستار بند

کی دوکان پر جا کر دَم لیا۔ وہاں فاختئی رنگ کی ایک دستار کا آرڈر دیا۔ پرنس کے درباری اسی رنگ کی دستار پہنتے تھے۔ ان کاموں کے بندوبست والنصرام میں دو بج گئے۔ ڈھائی بجے گھر واپس آیا اور کھانا کھا کر جی بھر سویا۔ بعد مغرب پرنس کے موٹر خانہ کی ایک موٹر دروازے پر آ کر رکی۔ ڈرائیور نے گاڑی سے اتر کر مجھے اطلاع دی کہ آپ کی یاد ہوئی ہے۔ ٹھیک ساڑھے سات بجے تیار رہیے گا۔ میں فانی صاحب کو ان کے گھر سے لے کر ادھر آؤں گا۔ میں نے ہاتھ منہ دھو کر دوسرے کپڑے پہنے۔ ٹھیک ساڑھے سات بجے اسی موٹر میں فانی آئے اور مجھے درباری لباس پہنے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ آج ہم دونوں ساتھ ہل فورٹ پہنچے۔ کل کی طرح آج مجھ پر وہ وحشت تو سوار نہ تھی، مگر نہ جانے کیوں پاؤں میں ایک کپکپی سی ضرور تھی۔ آج ڈنر ٹیبل پر تین معزز صورتیں نئی نظر آئیں کھانے پر پرنس زیادہ تر انھیں سے مخاطب رہے۔ یوں مجھے پرنس کو اچھی طرح دیکھنے اور سمجھنے کا کافی موقع مل گیا۔

نو وارد اصحاب میں ایک وجیہہ اور رئیس صورت معمّر بزرگ تھے، جن کی ایک ایک ادا بتا رہی تھی کہ یہ امیر اور لوتر ڈول کے امیر ہیں پرنس ان کو پیا کہہ کر خطاب کرتے تھے۔ دوسرے بزرگ وجاہت ذاتی سے محروم سانولے رنگ کے معمولی شکل وصورت کے آدمی تھے، جن کا قیمتی لباس اگر اُتار لیا جاتا تو دیکھنے والا انھیں کسی دفتر کا کلرک سمجھنے پر مجبور تھا۔ تیسرے مہمان اپنی صورت سے اسّی کے لگ بھگ معلوم ہوتے تھے۔ اگرچہ یہ قیمتی لباس پہنے ہوئے نہ تھے، مگر شرافت خاندانی اور علمی وقار ان کی بات چیت اور رکھ رکھاؤ سے ہویدا تھا۔ انھیں

پرنس کیر یو گبھرا کر پکار رہے تھے۔

ڈنر معمول کے مطابق ایک گھنٹے میں ختم ہوا۔ آج دربار میں پہلے صوفے پر امک جنگ اور دھمک جنگ کے بجائے پیا اور کیر یو کی نشست تھی۔ یہ لوگ دوسرے صوفے پر بیٹھے تھے۔ صدر میں پرنس کی کرسی کے قریب ایک دوسری کرسی پر وہی سانولے مہمان متمکن تھے۔ ان کے آگے ایک بیش قیمت گول میز پر چاندی کا نہایت شفاف پاندان رکھا تھا۔ انھوں نے پان بنا کر پہلے پرنس کو ایستادہ ہو کر نہایت ادب سے پیش کیا۔ پھر خود کھایا۔ دربار میں ہر شخص جب اپنی اپنی جگہ بیٹھ چکا تو پرنس مجھ سے مخاطب ہوئے۔ فرمایا "صدق تم اپنے ساتھ غزلوں کی بیاض بھی لائے ہو؟" میں نے کھڑے ہو کر دست بستہ عرض کی "سرکار غزل کی بیاض میرے ساتھ شاذ و نادر ہی رہتی ہے۔ آج بھی معمول کے مطابق نہیں ہے۔"

فانی نے کھڑے ہو کر عرض کیا "ان کے لئے بیاض کی ضرورت بھی نہیں۔ بچپن سے اب تک جو کچھ کہا ہے سب کا سب حافظے میں محفوظ ہے۔ آپ سننا چاہیں تو یہ مہینوں اپنا کلام زبانی سنا سکتے ہیں اور صرف یہی نہیں بلکہ مشہور اساتذہ کے دیوان کے دیوان حفظ ہیں۔"

پرنس نے مجھ پر حیرت و استعجاب کی نظر ڈالی۔ فرمایا تم پیا اور کیر یو کے درمیان آکر بیٹھو۔ میں اٹھ کر درباری آداب بجالایا اور پرنس کے داہنے ہاتھ والے صوفے پر ان تازہ مہمانوں کے بیچ میں بیٹھ گیا۔

اب پرنس نے ان سانولی صورت کے مہمان کی طرف اشارہ کرکے فرمایا، صدق! یہ ہمارے ماموں نواب قدرت نواز جنگ بہادر ہیں۔ علاوہ اپنی ذاتی اور آبائی معاشں کے نظام گورنمنٹ کے ملیٹری سکریٹری بھی ہیں۔ میں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر سلام کیا۔ نواب صاحب نے بھی ایستادہ ہوکر میرے سلام کا جواب دیا۔ پھر ہاتھ جوڑ کر پرنس سے فرمایا "یہ سرکار کی بندہ نوازی ہے جو اس طرح غلاموں کی عزت بڑھاتے ہیں۔ میں تو ایک ادنئے فدوی ہوں۔"

پرنس پھر مجھ سے مخاطب ہوئے۔ فرمایا "تمہارے بائیں ہاتھ پر نواب نامر الدولہ ہیں جو میرے مرحوم دادا کے رفیق خاص اور مصاحب تھے۔ خاندانی امیر ہیں میں انھیں پیا کہتا ہوں۔" میں نے اٹھ کر ان کو سلام کیا۔ وہ بھی کھڑے ہو گئے اور بڑی خندہ پیشانی سے میرے سلام کا جواب دیا۔ پھر ارشاد ہوا "تمہارے داہنے ہاتھ پر قاری سلیمان ہیں، جو بچپن میں میرے اور میرے بھائی (ولی عہد) کے اتالیق تھے۔ میں ان سے بہت مانوس تھا۔ ان کو گیرلو کہتا ہوں۔"

اس تعارف کے بعد فرمایا "اچھا اب اپنی وہی غزل پڑھو، جس کے ایک شعر نے مجھے پہروں تڑپایا ہے۔ فانی! تم اس رات کا واقعہ صدق کو سناؤ، جب پہلی بار تم نے وہ شعر مجھے سنایا تھا اور جو کیفیت وہ شعر سن کر میری ہوئی، وہ بھی بتاؤ۔"

فانی مجھ سے مخاطب ہوئے، فرمایا "صدق صاحب آپ کا یہ شعر سن کر سے

اس کے لطفِ عام کو غیرت نہیں کرتی قبول   اور میں کمبخت لطفِ خاص کے قابل نہیں

سرکار کی جو کیفیت تھی اسے میں لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا۔ تقریباً نصف گھنٹے تک مجھ سے یہی شعر پڑھواتے رہے۔ کسی طرح سیری نہ ہوتی تھی۔ پچاسوں سوالات آپکے متعلق فرما ڈالے۔ مجھے جس قدر علم تھا میں عرض کرتا گیا۔ اب حقیقتِ حال میری سمجھ میں آئی کہ یہ سب کچھ انہیں کی کارستانی ہے۔

پرنس نے فرمایا "فانی یہ بتاؤ کہ یہ شعر میں نے تم سے کتنی بار پڑھوایا ہے؟" فانی بولے "کم سے کم نو بار"۔ پرنس نے فرمایا "پیا! استادوں کے کچھ سینگ دم نہیں ہوتے، جو ایسا مکمل شعر کہہ لے وہی استاد ہے۔" پیا نے ہاتھ جوڑ کر کہا "بہت ہی درست ارشاد ہوا۔ پھر کہنے لگے "صاحب کیا خوب بات فرمائی ہے کہ استاد کے سینگ دم نہیں ہوتے، جو ایسا مکمل شعر کہہ لے وہی استاد ہے۔ صدق صاحب مبارک ہو آپ کو استادی کی سند سرکار سے عطا ہوئی یہ بڑے فخر کی بات ہے۔" میں نے اٹھ کر پہلے سرکار کو پھر پیا کو سلام کیا۔ حکم ہوا کہ کوئی غزل سناؤ۔ میں نے پرنس سے مخاطب ہو کر مطلع پڑھا ہے

محبتِ عشاق، اے خود کام! ایسے حاصل نہیں
تجھ کو بے پروا جو رہنے دے، وہ جذبِ دل نہیں

پرنس نے نہایت شگفتگی سے بہت ہی بہت اچھا فرمایا۔ فانی، پیا، حکیم صاحب، نواب قدرت نواز جنگ۔ سب نے تعریف کی۔ ایک جنگ اور ڈھمک جنگ نے بھی داد دی۔ حسنِ مطلع تھا۔

گفتنی ہر ماجرائے غم، مگر کس سے کہیں
آشنا دردِ محبت سے تمہارا دل نہیں

پرنس نے فرمایا "پیا! کیا سادہ اور پُر اثر کلام ہے۔" پیا کہنے لگے "صاحب! غلام کو داغ صاحب یاد آگئے۔" پھر مجھ سے کہنے لگے "صدق صاحب! مگر کس کی سے کہیں، کیا ٹکڑا رکھ دیا ہے۔" میں نے اٹھ کر پہلے پرنس کو پھر پیا کو سلام کیا۔ پرنس نے فرمایا "صدق! پیا کے سامنے شعر پڑھ کر داد لینا کوئی آسان کام نہیں۔ انھوں نے اعلیٰ حضرت مرحوم کے سامنے بارہا داغ کو پڑھتے ہوئے سنا ہے۔" میں نے سر خم کیا۔ غزل میں جب یہ شعر آیا ؎

میرے دشمن وصل سے مایوس ہوں، اے غمگسار
اس کی غفلت ہی تو کہتی ہے کہ "غافل نہیں

پرنس نے بے ساختہ 'ویری بیوٹی فل' فرمایا۔ پیا اور فانی نے بے انتہا تعریف کی۔ پیا نے پرنس سے ہاتھ جوڑ کر عرض کی "صاحب یہ فیضانِ عشق ہے، خانہ زاد تو سمجھ گیا۔ دوسرے کے بس کی یہ بات نہیں۔" پرنس خوش دلی سے ہنسنے لگے۔ پیا اپنی بات پر مصر کہ سرکار تحقیقات فرمالیں، اگر یہ کسی پر عاشق نہ ہوں تو غلام کے منہ پر تھوک دیجیے۔" اس پر سب لوگ ہنسنے لگے۔

پرنس نے فرمایا "یہ تو میرا عقیدہ ہے کہ عشق کے بغیر شاعری کرنا جھک مارنے کے مترادف ہے۔" فانی نے ہاتھ جوڑ کر عرض کی "بہت صحیح ارشاد ہوا۔ بغیر عشق کے شعر میں لطف و لذت پیدا ہی نہیں ہوتی۔" پیا نے فرمایا "صاحب! غلام تو یہ عرض کرتا ہے کہ جس نے

عشق نہیں کیا وہ غزل کیا شعر بھی نہیں کہہ سکتا۔ کوئی عالم سحر اس نکتہ لطیف کو کیا سمجھے گا۔ اس کی غفلت ہی تو کہتی ہے کہ وہ غافل نہیں ، ہائے سبحان اللہ سبحان اللہ !" میں سلام کرتے کرتے تھک کر چور ہو گیا کیونکہ ہر شخص کی تعریف پر مجھے کھڑے ہو کر سلام کرنا پڑتا تھا۔ خصوصاً پرنس کے ہر لفظ پر سات سات فرشی سلام۔ غزل خوانی اس دن وبال جان بن گئی۔ مختصر یہ ہے کہ یکے بعد دیگرے پرنس نے پانچ غزلیں پڑھوائیں اور ہر غزل کا ایک ایک شعر کم از کم دو مرتبہ تو پڑھنا ہی پڑا۔ بعض شعر پرنس نے تین تین بار پڑھوا کر سنے۔ جب یہ سلسلہ ختم ہوا تو میں سلاموں کی اس تواعد سے قریب قریب بے دم ہو چکا تھا۔

اب پرنس نے فرمایا " بہت اچھا کلام ہے۔ اس کے علاوہ صدق کو میں نے بہت گہری نظر سے دیکھا۔ ہر لحاظ سے میری صحبت میں بیٹھنے کے قابل ہیں "۔ میں اس عزت افزائی پر اٹھ کر آداب بجا لایا۔ نواب قدرت نواز جنگ اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے پاس آئے میں تعظیماً کھڑا ہو گیا۔ انھوں نے مصافحہ کر کے مجھے مبارکباد دی کہ آپ سے سرکار نے پانچ غزلیں مسلسل سنیں۔ یہ فخر آپ کے سوا اس دربار میں آج تک کسی کو نصیب نہیں ہوا۔ پھر سرگوشی کے لہجے میں فرمایا " صدق صاحب یہ بہت بڑا دربار ہے "۔ میں نے مناسب الفاظ میں شکریہ ادا کیا۔

ڈھمک جنگ نے سرکار سے دست بستہ عرض کی اب سرکار کے طفیل میں فدوی روزانہ صدق صاحب کے درشن کیا کرے گا۔

ایک جنگ ان کی ہم زبانی کرنے لگے۔ مگر مجھے پہلے دن کی بے اعتنائی بھولی نہ گئی۔ میں نے دل میں ایک تہیہ کیا، اور پہلی بار درباری نفاق کو دل میں چھپا کر بہ خندہ پیشانی اُن حضرات کی قدر دانی کا شکریہ ادا کیا۔

سچ پوچھئے تو ان کی بے اعتنائی ہی میری مصاحبت کا باعث ہوئی، ورنہ میں فانی کے تیار کئے ہوئے اُس پھندے کو ہزار ترکیبوں سے توڑ کر نکل بھاگتا۔ مگر یہاں تو اب قدم جمانے کی فکر تھی نکل بھاگنے کا کیا ذکر۔ غرض اس صحبت میں خود پرنس کی زبانی میرے اعزازی مصاحبت کا اعلان ہو گیا۔

کیرپو (قاری سلیمان صاحب) ذی علم اور با کمال بزرگ تھے۔ ان سے مل کر مجھے دلی مسرت ہوئی۔ پرنس کے اشارے پر معزز اور ہنڈوچو کی پر بیٹھے، طبلے پر تھاپ پڑی اور اہل فورٹ کی اصطلاح میں مشاعرہ شروع ہوا۔ مصاحبوں نے سرکاری کلام کی ایسی ایسی داد دی کہ بے داد کی منزل تک پہنچا دیا۔ کہی ہوئی بات کا دُہرانا میرا شیوہ نہیں۔ مختصر یہ کہ اسی دھما چوکڑی اور گرما گرمی کے ساتھ وہ رات بھی گذر گئی۔ ۳ بجے مجھے اور فانی کو خدا حافظ کہہ کر رخصت کیا۔ نواب قدرت نواز جنگ، پیا اور کیرپو سب نے زحمت پائی۔ باہر نکل کر ان حضرات نے مجھ سے نہایت گرم جوشی سے مصافحہ کیا، اور آج کی ملاقات پر اظہار مسرت فرمایا۔ میں نے مناسب الفاظ میں فرداً فرداً شکریہ ادا کیا۔

ان سے فرصت ملی تو اس طفل ماہ رخسار نے جس کا تفصیلی ذکر پہلی رات کے دربار میں نرت کے سلسلے میں آچکا ہے، آگے

بڑھ کر مجھ سے مصافحہ کیا اور میرے کلام کی بڑی تعریف کی، پھر کہا کہ یہ غزلیں جو آپ نے دربار میں پڑھی تھیں، مجھے لکھ کر عنایت فرمائیے۔ آپ کے کلام میں ایسا اثر ہے جس نے مجھے بے چین کر دیا۔ میں نے وعدہ کیا اس نے کہا کل اپنے ساتھ لکھ کر لائیے۔ دیکھئے وعدہ خلافی نہ ہونے پائے فانی نے کہا کہ ان کی شامت ہے کہ آپ سے وعدہ خلافی کریں گے۔ اس گفتگو کے بعد میں نے ہاتھ ملا کر اسے رخصت کیا، اور فانی کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گیا۔ راستے میں فانی نے مجھے مبارکباد دی اور کہا کہ پرنس نے تو تم کو پسند کر لیا، مگر میں تمہاری زبانی سننا چاہتا ہوں کہ خود تم نے اس دربار کے متعلق کیا رائے قائم کی۔ تم دوراتیں خوشی سے بیٹھے، یا مجبوری سے۔ آئندہ تمہارا کیا ارادہ ہے۔

میں نے کہا، "پرنس کیا بہ لحاظِ صورت اور کیا بہ لحاظِ سیرت، بے مثل ہیں، ایسے نیک خو اور خوبصورت شاہزادے کی مصاحبت پر میں جس قدر فخر کروں کم ہے۔ مجھے یہ دربار بہت پسند آیا۔ رہے درباری وہ خاندانی امرا ہیں یا اعلیٰ عہدے دار، یا اہلِ علم اور صاحبانِ کمال۔ ایسی صحبتیں قسمت ہی سے میسر آتی ہیں۔ مجھے گورنمنٹ سے جو تنخواہ ملتی ہے وہ میری ضروریاتِ زندگی کے لیے کافی ہے۔ پرنس کی عطایا سخا کی مجھے احتیاج نہیں۔ جو سوال ہے وہ شب بیداری کا ہے۔ رات بھر جاگنے کے بعد اپنے فرائض کیونکر انجام دوں گا۔" فانی نے کہا، "بے شک یہ سوال غور طلب ضرور ہے لیکن اس پر اطمینان سے غور کریں گے۔ فی الوقت تو میں تمہارے منہ سے منظوری سننا چاہتا تھا، وہ الحمد للہ سن لی"۔ پھر کہنے لگے،

میں یہاں بتیس دانتوں میں زبان کی طرح تنہا تھا۔ تمہاری وجہ سے میرا دل قوی ہو گیا۔ مگر میری ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا اس دربار کے کسی آدمی کو کبھی بھولے سے اپنا دوست نہ سمجھنا۔ یہ سب کے سب ناقابلِ اعتبار اور منافق ہیں۔ بہ ظاہر سب سے خلوص و محبت سے پیش آنا، مگر دل میں سب سے ڈرنا۔" میں نے کہا، "یہ تو مصیبت ہے"۔ فانی کہنے لگے، "کچھ بھی نہیں، گل کے پہلو میں ہمیشہ کانٹے رہے ہیں اور آج تک کیا کسی ذی عقل نے کانٹوں کے ڈر سے گل چینی سے پہلوتہی کی ہے، ہرگز نہیں۔ البتہ جس نے غفلت برتی ہے اس کے ہاتھ کو صدمہ بے شک پہنچا ہے"۔

یہ مشاعرے جن کا ذکر دو راتوں میں آچکا ہے ۱۹۳۶ء سے تعلق رکھتے ہیں۔ اب میری مصروفیات نہ پوچھئے۔ رات کو بلا ناغہ پرنس کے ساتھ ڈنر کھانا، تین بجے تک سرکاری غزلوں کی داد دینا، گھر پلٹ کر چار بجے سونا، جو دراصل خوابِ غفلت سے بیدار ہونے کا وقت ہے، نو بجے دن کو جاگنا، بہ عجلت دس بجے دن تک تیار ہو جانا، شام کو چار سے چھ تک اقامت خانے کے حسابات دیکھنا، منشی جی کو مناسب ہدایات دینا، بورڈرس کی شکایتیں سننا، ان کے فیصلے کرنا، سات بجے سے پھر دربار کی تیاری اور اہتمام میں مصروف ہو جانا، فانی کے پاس البتہ درباداری کے علاوہ اس وقت کوئی کام نہ تھا۔ وہ اپنے وقت کے مالک تھے۔ کیونکہ اسکول سے رخصت بے تنخواہ پر ہونے کی وجہ سے ان کو کوئی واسطہ نہ رہ گیا تھا۔ وہی دو سو روپے مہاراجا

سرکشن پرشاد بہادر کی سرکار سے ان کو ملے جاتے تھے۔ رخصت بیماری کا الاؤنس بہ صورت نصف تنخواہ سال بھر میں کہیں ایک ہی بار ملتا تھا۔ اس وقت فانی کی بسر اوقات صرف قرض پر تھی۔ مہاجنوں کا سود بڑھتا جاتا تھا۔

اتفاق سے ایک سال پہلے یعنی ۱۹۳۵ء ہی میں میری رفیقہ حیات مجھے داغِ مفارقت دے چکی تھی۔ میں تنہا تھا اور رات رات بھر کی غیر حاضری کا مجھ سے کوئی جواب طلب کرنے والا نہ رہ گیا تھا، ورنہ مشکل کا سامنا ہوتا۔ فانی بوڑھے تھے، اور ان کی بیوی بھی جوان نہ تھیں۔ اس لئے ان پر بھی کوئی مذہبی یا اخلاق پابندی نہ رہ گئی تھی جو اس درباری میں سدِّ راہ ہوتی۔ دونوں ظرف "نے غمِ زرد نے غمِ کالا" کا مضمون تھا۔ گھر میں تنہا نہ لیٹے دربار کی رنگ رلیوں میں رات گزار دیتا۔

میں اس سے پہلے سر سید ابو جعفر آف پیر پور (اودھ) اور پرنس حبیب اللہ خاں صاحب مرحوم آف بھوپال کی مصاحبت میں کئی کئی برس گزار چکا تھا، اس لئے اس غلط فہمی میں مبتلا تھا کہ مصاحبت مجھے کہیں سیکھنے نہیں جانا ہے۔ اس فن کے سارے ایچ پیچ سے واقف ہوں۔ لیکن پرنس آف حیدر آباد کے دربار میں پیا (نواب ناصر الدولہ) کی مصاحبت دیکھ کر میرے ہوش اڑ گئے اور مجھے تسلیم کرنا پڑا کہ پیا اس فن کے استادِ کامل ہیں اور مجھے ہنوز ان سے برسوں سیکھنے کی ضرورت ہے۔

دربار میں کوئی مضمون زیر بحث ہو، یہ ممکن نہ تھا کہ پیا

خاموش رہیں۔ ہر فن میں دخل دیتے اور ایسی دلچسپ گفتگو کرتے کہ سارا دربار انھیں کا منہ دیکھتا رہ جاتا۔ پیا کی مصاحبت دیکھ کر مصاحبت کا یہ گُر میری سمجھ میں آیا کہ مصاحب کی موجودگی میں بادشاہ کسی وقت دل گرفتہ اور مکدّر نہ ہونے پائے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام آسان نہیں، بلکہ بہت مشکل ہے۔ بے شمار چٹکلے اور لطیفے پیا کو یاد تھے جنھیں موقعے اور محل سے وہ ایسی خوبصورتی سے بیان کرتے کہ پرنس کے ساتھ ہم لوگ بھی بے حد لطف اندوز ہوتے۔ پیا کو اس وقت کیا خبر تھی کہ میں جو تمام عالم کے لطائف دربار میں بیان کرتا ہوں ایک روز میرا ایک واقعہ بھی لطیفے کی شکل اختیار کر کے ملک بھر میں مشہور ہو گیا۔

واقعہ یہ ہے کہ یوں تو اعلیٰ حضرت نواب میر محبوب علی خاں صاحب خلد آشیاں کے موکب میں پیا نے ہندوستان کے متعدد سفر کیے تھے، مگر ہندوستان کے باہر کبھی جانے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ یہ اتفاق بڑھاپے میں پیش آیا، جب پہلی بار پرنس کے ہمراہ مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کو تشریف لے گئے۔ عبا، قبا اور عمامے کو علمائے ہند کے زیبِ زیبا اور زینتِ سر دیکھ کر پیا جانتے تھے کہ یہ لباس صرف علما اور صلحا ہی سے مختص ہے۔ جس روز بغداد پہنچے اُس کے دوسرے ہی دن ہوٹل میں پرنس کے پاس بیٹھے تھے کہ خادم نے ایک ملاقاتی کارڈ پرنس کے سامنے پیش کیا۔ ملاقاتی ایک جوان عمر کا مصری تھا، جس کی سُرخ و سفید رنگت پر سیاہ ڈاڑھی بہت زیب دیتی تھی۔ اسے عمامے اور عبا میں ملبوس

دیکھ کر پیا دینی پیشوا سمجھ کر سروقد تعظیم بجالاتے، مصافحہ کر کے ہاتھ چومے، آنکھوں سے لگائے، اہلاً وسہلاً، مرحبا کہہ کر خیر مقدم کیا، پھر اپنی جگہ نہایت ادب سے بیٹھ گئے، مصری تھوڑی دیر فرانسیسی زبان میں پرنس سے باتیں کر کے جب جانے لگا تو پیا نے پھر اسے احترام سے رخصت کیا۔ اس کے جانے کے بعد پرنس دریافت کیا، صاحب! یہ کوئی عالم دین تھے، یا کسی درگاہ کے متولی؟ چہرہ کیسا نورانی تھا کہ خانہ زاد کا دل روشن ہوگیا۔" پرنس نے فرمایا" کاروباری آدمی تھا، میرے پاس اس غرض سے آیا تھا کہ حسینان بغداد کو ملاحظہ فرمانے کے لیے، ایک گھنٹہ مجھے بھی مرحمت فرمائیے تو ایسی ایسی صورتیں دکھاؤں کہ حسینانِ ہندیکسر آپ کی نگاہوں سے گرجائیں۔"

پیا نے کہا، "استغفر اللہ! تو یہ حرام زادہ قرمساق تھا۔ اللہ تعالیٰ! مجھے معاف فرمائے۔" پرنس کا ہنسی کے مارے براحال تھا۔ صوفے پر لوٹے جاتے تھے۔ پیا منہ پر طمانچے مار مار کر توبہ اور استغفار میں مصروف تھے۔ غرض پھر اس سفر میں پیا نے کسی عالم دین سے بھی مصافحہ نہ کیا۔ سچ ہے کہ دودھ کا جلا بیٹھا پھونک پھونک کر پیتا ہے۔ دربار میں جب کبھی ذکر آجاتا، پیا نادم ہوجاتے۔ اور کہتے صاحب! وہ ذاتِ پاک اور غفور الرحیم ہے، خانہ زاد سے ناوانستگی میں یہ گناہ سرزد ہوا ہے، کیا عجب ہے کہ معاف فرمادے۔" پیا پرنس کے دربار کے نہایت نیک نفس، دلچسپ درباری اور امیر تھے۔ خدا مغفرت فرمائے۔

غرض انھیں جشن سامانیوں اور رنگ رلیوں میں ماہ صیام کا مبارک مہینہ آ گیا۔ وابستگانِ دامنِ دولت کو عید کے موقعے پر پرنس کے دربار سے شیروانیاں عطا ہوتی تھیں۔ یہ وہ عطائے عام تھی جس سے کوئی مصاحب، کوئی خدمت گار، کوئی سقّہ، کوئی فراش، کوئی باورچی، حتیٰ کے باورچی خانے کا اسٹاف تک محروم نہ رہتا تھا۔

ان شیروانیوں کی مراتب کے لحاظ سے قیمتیں مقرر تھیں۔ مصاحبوں کی شیروانی ڈھائی سو سکّہ انگریزی کی ہوتی تھی، خدمت گاروں کے لباس کے لئے سو روپے کی منظوری تھی، خود پرنس کی شیروانی پر چھ سات سو کی لاگت بیٹھتی تھی۔ عید کی شام کو ہل فورٹ کی بہار دیکھنے کے قابل ہوتی تھی جس کا تفصیلی ذکر آگے آئے گا۔ یہ شیروانیاں سکندر آباد کے ایک مشہور درزی جان برٹن کی دُکان سے تیار ہو کر آتی تھی۔

دستور یہ تھا کہ ماہِ صیام میں پرنس دو چار پیڈو ہیاریوں کے ہمراہ نو دس بجے دن کو جان برٹن کی فرم میں تشریف لے جاتے، برٹن شاہانہ استقبال کرتا، فرم کے اس حصے میں جہاں صرف شیروانیوں کے تھان ہوتے تھے، کرسیاں بچھ جاتیں، برٹن ادب سے ہاتھ باندھے سامنے کھڑا رہتا، فرم کے نوکر جا کر الماریوں سے تھان نکال نکال کر پرنس کے حضور میں پیش کرتے۔ بے شمار تھانوں کے ملاحظے کے بعد کسی ایک مصاحب کی شیروانی کا کپڑا پسند آتا۔ ہر مصاحب کے جسم کی ناپ فرم کے رجسٹر میں درج رہتی تھی۔ پسندیدہ تھان پر مصاحب کے نام

کی چٹ لگا دی جاتی تو وہ تھان سب سے الگ کر دیا جاتا۔ یہ تھان خاص
شیروانیوں کے لئے فرانس سے تیار ہو کر آتے تھے اور عموماً دو گز کے
ہوتے تھے۔ مقصد ان دو گزی تھانوں کا یہ تھا کہ جس کپڑے کی شیروانی
آپ بنالیں ویسی دوسرا نہ پہن سکے۔

ہر تھان کے ڈیزائن کے لحاظ سے اس کے ساتھ بٹن بھی فرانس
ہی سے آتے تھے، جو نہایت بیش قیمت ہوتے تھے۔ ایک صاحب
کی شیروانی کے انتخاب کے بعد پرنس دوسرے کے لیے کپڑا پسند
فرمانے کا کام شروع کر دیتے۔ اس میں سیکڑوں تھانوں کے ملاحظے
کے بعد کپڑے کا انتخاب فرماتے۔ اس تھان پر بھی قاعدے کے
مطابق مصاحب۔ گمنام کا لیبل لگ جاتا۔

مختصر یہ کہ دو تین ہی کپڑوں کے انتخاب میں شام ہو جاتی
اس کام کو دربار کی اصطلاح میں "زندہ بہلانا" کہتے تھے۔ جتنی دیر پرنس
برتن کی بزم میں تشریف فرما رہتے۔ حرم کے اس حصے میں کوئی
وزیر یا امیر قدم نہ رکھ سکتا، صرف وہ یورپین لیڈیز جن سے
بے تکلفی کی ملاقات تھی اس روک ٹوک سے مستثنیٰ تھیں۔ لیکن
ان کی تعداد نہایت محدود تھی۔ یہ بڑے بڑے فوجی یورپین افسروں
کی بیگمات ہوتی تھیں۔

ماہ مبارک کے طول طویل دن اس شغل میں آسانی گزر
جاتے۔ اس مہینے کے احترام میں رات کے مشاعرے موقوف
رہتے، ڈنر کے بعد رات گئے ۲ بجے تک اِدھر اُدھر کی باتیں
رہتیں، اکثر و بیشتر مذہبی مسائل معرضِ بحث میں آتے،

یا اولیاء اللہ کے تذکرے رہتے۔ بیچ بیچ میں اہلِ حسن کا مذکور بھی رہتا تھا۔ عید کے ایک دن پہلے سے اربابِ نشاط کے طائفے جنھیں عید کی رات کے مجرے کے لئے دہلی، آگرہ، لکھنؤ اور بمبئی سے طلب کیا جاتا، حیدرآباد میں اترنا شروع ہو جاتے۔ شاکر صاحب ان کی سربراہی پر مقرر ہوتے۔ اس زمانے میں شاکر صاحب کی شان دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ سر پر کتھئی رنگ کی دستار جامے کمر سے بگلوس باندھے، ان مہمانوں کی خدمت گزاری میں ایسا فخر محسوس کرتے کہ شاید ہی کسی درگاہ کے متولی نے عرس کی مصروفیات میں اس طرح کا فخر محسوس کیا ہو۔

دربار میں عید کی رات

طوائفوں کی طلبی میں پرنس بے دریغ روپیہ صرف کرتے تھے۔ میں نے ہفت سالہ مصاحبت میں ایک بار ایک ایجنٹ کی روانگی بہ چشم خود دیکھی ہے۔ وہ ایمانداری کے ساتھ درج ذیل ہے۔

رمضان کی ستائیسویں تاریخ تھی، میں اور فانی دربار میں اپنی اپنی جگہ بیٹھے تھے، یکایک صدیقی صاحب ایک ایجنٹ درباری آداب ادا کر کے ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ یہ پچاس نوبلے

ماہانہ پرنس کی سرکار سے پاتے تھے، کھانا ساتھ کھاتے تھے۔ پرنس ان سے مخاطب ہوئے۔ فرمایا "تم صبح کی ٹرین سے بمبئی جا رہے ہو۔" صدیقی صاحب نے سرِ تسلیم خم کیا۔ پرنس نے فرمایا "میں حکم دے چکا ہوں، تم جانے سے پہلے فلاں شخص سے زادِ راہ لے لینا۔ تمہارے اس سفر کے لئے میں نے سات ہزار کی منظوری دی ہے۔ فرسٹ کلاس میں سفر کرنا بمبئی میں فرسٹ کلاس ہوٹل میں ٹھہرنا۔ شہر کی سب گانے والیوں سے ملنا جو تمہیں پسند آئے اس سے بات چیت پختہ کر لینا۔ اگر یہ روپیہ جو تم ساتھ لے جا رہے ہو، کفایت نہ کرے تو تم مجھ کو ایک تار دے دینا۔ میں اور روپیہ بھیج دوں گا۔ مگر ایک بات کا خیال رکھنا جس روز وہ لوگ حیدر آباد قصد سے بمبئی ... کے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر آ جائیں اسی وقت سے وہ ہمارے مہمان ہیں۔ پھر ان کے کھانے پینے کا اہتمام اسی درجے پر کرنا جو ہمارے شایانِ شان ہو۔ خبردار پیسے کا منہ نہ دیکھنا۔" صدیقی صاحب نے ہاتھ جوڑ کر عرض کی "کیا مجال، فدوی سرکار کی شان کا قدم قدم پر خیال رکھے گا۔"

پرنس نے پیا سے مخاطب ہو کر فرمایا "کیوں پیا! پلیٹ فارم پر آنے کے بعد وہ ہمارے مہمان ہو چکے۔" پیا نے ہاتھ جوڑ کر کہا "بہت صحیح ارشاد ہوا۔" پھر کہنے لگے "بے شک بے شک ان کی مہمان داری اسی درجے کی ہونی چاہیئے جو ایک شاہ زادے کے عالی قدر مہمانوں کے شایانِ شان ہو۔"

پرنس نے صدیقی صاحب کی طرف دیکھا، مطلب یہ تھا کہ سن لیا تم نے۔ صدیقی صاحب اس وقت غالباً دل میں حساب

لگا رہے تھے کہ ان سات ہزار میں پانچ ہزار تو یاروں کے یقینی ہیں، منہ سے کچھ نہ کہہ سکے، ہاتھ جوڑ کر سر کو ادب سے خم کیا۔

صدیقی صاحب اس حیثیت کے آدمی تھے کہ شاید ہی اپنی عمر میں کبھی انٹر کلاس میں بیٹھے ہوں۔ مگر آج ان کو حکم تھا کہ فرسٹ کلاس میں سفر کریں۔ یہ عزت محض اس کام کے بدولت ملی تھی جو انھوں نے اپنا دین اور ضمیر بیچ کر اختیار کیا تھا۔ انصاف شرط ہے، کیا دین کی اتنی قیمت بھی نہیں کہ ایسے مواقع پر پانچ سات ہزار روپے ایسے دین فروشوں کی جیب میں چلے جایا کریں۔ فانی بے چارے پیسے پیسے کو محتاج تھے۔ مہاجنوں کا قرض بڑھتا جاتا تھا، اور صدیقی صاحب کی پانچوں انگلیاں گھی میں تھیں۔ جس مد میں جتنا جی چاہے لکھ دے۔ کوئی ان کے حساب کا چک کرنے والا نہیں۔ کس کی شامت آئی تھی کہ وہ ان کے حساب پر نکتہ چینی کرے۔ غرض اس گفتگو کے بعد صدیقی صاحب جھک کر آداب بجالائے۔ پرنس نے خدا حافظ کہا اور وہ رخصت ہوئے۔

دوسرے ایجنٹ فاروقی صاحب ایک ایم اے تھے۔ اُن کی روانگی میں نے کبھی آنکھ سے نہیں دیکھی۔ ناظرین [illegible] صدیقی صاحب [illegible] کے واقعے سے فاروقی صاحب کی آمدنی کا انداز[illegible] لگا سکتے [illegible]

تیسرا ایجنٹ ایک پارسی تھا، جس کا [illegible] قیام بمبئی میں رہتا تھا۔ اس کے نام تحریری احکام جاری ہوتے تھے اور وہ ایسے موقع پر کوئی نہ کوئی تحفہ لے کر دربار میں حاضر ہو جاتا تھا۔ مگر اس کی مان دان صدیقی صاحب اور فاروقی صاحب سے کہیں زیادہ تھی۔

پہلی بار اس کی حد سے زیادہ بے تکلفی پرنس کے ساتھ دیکھ کر میں اس کو بھی کسی ریاست کا والی یا ولی عہد ریاست سمجھتا تھا، مگر حیرت یہ ہوئی کہ پرنس نے اس کا تعارف مجھ سے خود کرا دیا۔ وہ شخص لاکھوں پر ہاتھ مارتا تھا اور ایک ایک تختہ پر اتنا لے جاتا کہ جو صدیقی صاحب اور فاروقی صاحب دس سفر کرنے کے بعد بھی نہ پاتے تھے۔

چوتھے ایجنٹ درباری رفقا میں سے اور خانی کے ایک رفیق تھے۔ بے چارے یہ دیکھ کر کہ ایمانداری کے ساتھ رہنے میں کچھ ہاتھ نہیں آتا، بال بچوں کی خاطر ایجنٹ بن گئے تھے۔

ان مستقل ایجنٹوں کے علاوہ شیام صاحب اور تین صاحب کی طرح اور لوگ بھی اس منفعت بخش کام کو کرتے تھے، مگر ہر کارے و ہر مردے کے مصداق ان لوگوں کو وہ فارغ البالی کبھی نصیب نہ ہوئی جو صدیقی اور فاروقی کو حاصل تھی۔ انھوں نے دین ضرور بیچا مگر اس سے دنیا ہاتھ نہ آئی۔ بہ قول شخصے ؎

نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے ہوئے

چاندرات کی صبح ہی سے یہ قافلے نام پلی ریلوے اسٹیشن پر اترنا شروع ہوتے۔ شیام صاحب سر پر دستار جمائے کمر سے بگلوس باندھے، ہر قافلے کا استقبال کرتے، ناتکہ کو خوبدارانہ سلام کرتے، حالاں کہ ان کی عمر پچاس سال سے متجاوز ہو چکی تھی۔ کسی کو اس تپاک سے ملتے گویا کسی قریبی رشتہ دار کو برسوں کی مفارقت کے بعد دیکھا ہو۔ طبلچی اور سارنگیے سے دوستانہ اور برادرانہ ہاتھ ملاتے اور جو کوٹھی جس کے لیے نامزد ہو چکی تھی اسے اس میں لے جا کر ٹھہراتے۔

اس روز بقول انھیں کے ایک ہی عمرہ پتے کی بھی فرصت نہ ملتی۔ ہر قافلے کے ساتھ ناشتے میں شریک ہوتے، مریدوں کے ساتھ کھانے پر بیٹھتے، اور ہر ناگہ سے اس احترام سے پیش آتے کہ اگر کوئی سعادت مند بیٹا بھی اپنی ماں کا وہ احترام نہ کرتا ہوگا۔

عید کی رات میں فانی کے ہم راہ ہل ہو نمرست پہنچا تو محل کی آرائش دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ آج ان پری جمال، غلام کا حسن و جمال دیکھنے کے قابل تھا۔ سرخ و سبز رنگ کی قیمتی شیروانیوں میں ہر خادم خود رئیس زادہ نظر آتا تھا۔ فاختئی رنگ کی دستار اور فیروزی انگوٹھی ان کی نازک کمروں پر وہ زیب دیتے تھے کہ نہ پوچھئے۔

اتنے میں وہی پری زاد لڑکا جو نرت کرنے میں کامل تھا عطر میں بسا ہوا سامنے سے گزرا۔ مجھے دیکھ کر ایک خوشگوار تبسم کے ساتھ اس نے دونوں ہاتھ سینے پر رکھ کر سر جھکا دیا (دربار میں سلام کا یہی طریقہ تھا) میں نے بھی اسی طرح سلام کا جواب دیا۔ شمامۃ العنبر کی دل آویز خوشبو سے سارا کمرہ مہکنے لگا۔ فانی درود پڑھنے لگے، میں نے ان کی طرف دیکھ کر یہ شعر پڑھا ؎

خوشبو سے ہو رہا ہے معطر مشامِ جاں
چلتی ہے کس طرف کی ہوا کچھ نہ پوچھئے

فانی جھوم گئے۔ کہا آگے کہو، میں نے کہا ؎

ناگفتنی ہے عشقِ بتاں کا معاملہ
ہر حال میں ہے شکرِ خدا کچھ نہ پوچھئے

اب کے فانی پھڑک گئے، بولے ماشاءاللہ اس وقت طبیعت حاضر

معلوم ہوتی ہے۔ میں نے کہا ہل فورٹ میں آجانے کے بعد طبیعت خود بہ خود حاضر ہو جاتی ہے۔

مصاحبوں کی آج پوری پلٹن ہل فورٹ میں موجود تھی۔ پچاسوں امیر زادے پرنس کو نذر دینے کے لئے حاضر ہوئے تھے۔ ہر شخص کے جسم پر قیمتی اور خوشنما شیروانی تھی۔ اور پورے محل میں ایسی بہار تھی جیسی میں نے کبھی نہ دیکھی تھی، سیکڑوں عہدے دار عید کی نذر جیبوں میں رکھے عید کے سلام کو حاضر تھے،

خدا خدا کر کے پرنس برآمد ہوئے۔ عہدے داروں سے پہلے امیر زادوں نے نذریں پیش کیں۔ پرنس ہر نذر پر ہاتھ رکھ دیتے تھے، خادم نذر اٹھا لیتا تھا، نذر دینے والا درباری سلام کر کے پیچھے ہٹ جاتا تھا۔ مجمع چھٹتا جاتا تھا۔ اغیار سے محفل خالی ہوئی تو مصاحبوں کی باری آئی۔ میری اور نانی کی نذر پرنس نے اپنے ہاتھ سے اٹھائی۔ یہ انتہائی عزت افزائی تھی۔ ہم دونوں نے شکریے کے سات سات سلام کئے۔

نذر کے جھمیلے میں بہت وقت گزر گیا۔ آج دس بجے پرنس خاصے کی میز پر تشریف لے گئے۔ عید کے ڈنر میں کم و بیش ستر پچھتر آدمی شریک طعام تھے۔ اس ڈنر میں جو تکلفات کئے گئے تھے ان کے تفصیلی ذکر کا موقع نہیں ہے۔ قابل ذکر صرف یہ بات ہے کہ آج بھی میرے اور نانی کے آگے ہوٹل سے آئی ہوئی دو دو چپاتیاں لگی تھیں۔ حیدرآبادی امیر ہوں یا غریب، صرف ناشتے میں توسٹ یا پراٹھا کھاتے تھے۔ دوپہر اور شام کو صرف چاول کا رواج تھا، خشکہ ہو یا بریانی۔ ملک ہی چاول کا تھا اس لئے اہلِ ملک چاول ہی رغبت سے

کھاتے تھے۔ ہم لوگوں کو ہندوستانی جان کر ہمارے آگے دو دو چپاتیاں لگادی جاتی تھیں۔ تاکہ ان نعمتوں سے جو پرنس کی میز کی زینت ہوتی تھیں ہم اپنے مذاق کے مطابق لطف اندوز ہوسکیں۔ ان چار چپاتیوں کی خاطر پرنس کے باورچی خانے میں انتظام تکلف بارد ہوتا۔ اس لیے خوردان کے اشارے پر یہ چپاتیاں نام پلی کے ایک ہوٹل سے آجاتی تھیں، جس کا مالک بھی ہماری ہی طرح ہندوستانی تھا۔

آج آخری ڈش کے موقعے پر ایک خادم نے پیڑی حلوا سوہن کی گول گول ٹکیاں پرنس کے سامنے لاکر ڈھیر کر دیں۔ میرے اندازے میں کسی طرح وہ ٹکیاں بیس سیر سے کم نہ ہوں گی۔ پرنس نے فرمایا "فانی یہ تمہارے وطن کا تحفہ ہے۔ یعنی لکھنؤ کا حلوا سوہن۔ تم اور صدق دونوں رغبت سے کھاؤ گے۔ یہ فرماکر ایک ایک ٹکیا اپنے ہاتھ سے ہم دونوں کو مرحمت فرمائی۔ ہم لوگ اٹھ کر آداب بجالائے پھر حکم دیا کہ ایک ایک ٹکیا پوری میز پر پہنچاؤ۔ خدام نے باقاعدہ سروس شروع کر دی۔ اس روز ہل فورٹ کی بالائی کے ساتھ دہی حلوا سوہن کھایا گیا۔ لوز کی طرف اس رات کوئی ملتفت نہ ہوا۔

آج کے ڈنر میں آٹھ دس اعلیٰ عہدے دار بھی تھے جن کو پرنس سے کوئی نہ کوئی خصوصیت تھی۔ مگر اس وقت صرف ایک کا ذکر مقصود ہے کمال الدین نام کمو تخلص۔ سرکاری باغات کی نگرانی سپرد تھی۔ ماتحتی میں صدہا مالی اور مالنیں کام کرتی تھیں۔ عاشق مزاج آدمی تھے۔ دفتر کے اوقات میں نوخیز اور خوبصورت مالنوں سے جی بہلاتے، اس شغل سے تھک جاتے تو شعر کہتے، صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ ابنائے زمانہ کی ناقدری سے وہ

سرمایہ تلف ہوگیا۔ نمونۂ کلام یہ ہے :

دل دودھ کو بے چین نہ مکھن کے لئے ہے

گولن سے سوا دخترِ گولن کے لئے ہے

شہر بھر میں اپنی کم خردی کی بدولت مشہور تھے۔ ان کے عقل و ہوش کے ادراک کے لئے یہی ایک لطیفہ کافی ہے۔ برسات کی ایک شام کو اپنے برآمدے میں کھڑے ہوئے تھے۔ بارش مسلسل ہو رہی تھی آپ نے ہیڈ مالی کو آواز دی۔ وہ بھیگتا ہوا دوڑا آیا۔ پوچھا' پانچ بج گئے ہیں' مالیوں نے اب تک گملوں میں پانی ڈالنا شروع نہیں کیا؟" اس نے گھبرا کر کہا۔"سرکار صبح سے بارش جو ہو رہی ہے۔ فرمایا' پروا کی بات نہیں۔ اُن سے کہو چھتریاں لگا کر پانی ڈالنا شروع کریں۔ فرض بہر حال فرض ہے' مفت کی تنخواہ نہ میں خود کھاتا ہوں نہ مالیوں کو کھانے دوں گا۔" اس روز سے برسات میں مالی چھتریاں لگا کر گملوں میں پانی ڈالنے لگے۔

اس فرض شناسی کا شہرہ رفتہ رفتہ شاہزادوں تک پہنچا۔ دونوں نے مشتاق ہو کر باری باری شرف باریابی بخشا' اور کمو میاں کو عقل سے بیگانہ محض پا کر نہایت محظوظ ہوئے۔ ولی عہد نے لنچ پر بُلانا شروع کر دیا۔ جونیئر پرنس ڈنر پر یاد فرمانے لگے۔ کمو میاں اپنی تنخواہ کس حد تک حلال کر کے لیتے تھے۔ اس کا حال تو اللہ جانے' دونوں وقت کے کھانے سے تو زندگی بھر کے لئے بے نیاز ہو گئے۔ کھانا بھی کیسا شاہزادوں کی میز کا کھانا' جس پر ہر قسم کی نعمتیں موجود رہتی ہیں۔ سرکاری باغ کے مہتمم کی یہ دعوتِ عام من و سلویٰ کے خوان سے کسی طرح کم نہ تھی۔

دونوں وقت الوانِ نعمت سے پیٹ بھرتے تھے۔ آخر اس مفت خوری نے آدمی سے گینڈا اور کچھ عرصہ کے بعد گینڈے سے ہاتھی بنا دیا۔ چلتا پھرتا وبالِ جان بن گیا۔ عید کی رات محفل سے جھومتے اُٹھے۔ بزمِ عیش و نشاط آراستہ تھی۔ آگرے کا کوئی طائفہ مجرا کر رہا تھا، مغنیہ کے پیچھے طبلے سارنگے، مجیرے بجانے والے قالین کے فرش پر اطمینان سے بیٹھے اپنا اپنا کمال دکھا رہے تھے۔ انھوں نے بے خیالی میں ایک کے پاؤں پہ پاؤں رکھ دیا۔ خود لڑکھڑائے اس نے بے ساختہ آہ کی۔ پرنس نے ذرا سختی کے ساتھ فرمایا، کلو! دیکھ کر چلو، تم تو اس مشہور ہاتھی کی طرح اپنی ہی فوج کو پامال کر رہے ہو۔ درباری ہنسنے لگے۔ میں نے دست بستہ عرض کیا سرکار! اپنی ہی فوج کی تخصیص مزہ دے گئی۔ اس پر پرنس بھی خوش دلی سے ہنس دیئے۔ فرمایا، بے شک یہ لوگ انھیں کی ذریات ہیں۔ کلو میاں خفیف ہو کر بیٹھ گئے۔

لائق اور تجربہ کار ایجنٹوں نے عید کی مبارک رات کے لئے ایک درجن گانے والیوں کا بندوبست کیا تھا، جن میں بعض جوان تھیں، بعض کی جوانیاں ڈھل چکی تھیں، مگر اپنے اپنے فن میں باکمال سب تھیں پرنس کا منشا تھا کہ ۔ ۔ ۔ کہ سب دربار میں موجود رہیں۔ اس مشکل کا حل یہ تجویز فرمایا کہ ایک طائفہ سامنے بیٹھ کر گائے باقی گانے والیاں مصاحبوں کے پاس صوفوں پر بیٹھ کر گانا سنیں۔ تیس سال کی ایک مغنیہ کو حکم ملا تم فانی کے پاس بیٹھو، بیس سال والی دوسری حسینہ میرے پاس بٹھائی گئی۔ فانی اس بھرے دربار میں اس عطائے خاص پر لجائے اور شرمائے تو بہت مگر "ورنہ ستانی بہ ستم می رسد" کے قولِ مشہور نے ڈھارس بندھائی۔

جھک کر آداب بجا لائے۔

مجھ سے ارشاد ہوا، صدق تم کو اپنے پارٹنر سے کوئی شکایت تو نہیں؟ میں نے عرض کیا، سرکار! میں قسمت کا قائل ہوں۔ جیسی کی قسمت ہوتی ہے وہ مزہ ملتی ہے۔ یہ بھی قسمت کے کھیل ہیں اور میں تقدیر کے آگے سر تسلیم خم کرتا ہوں۔ اسی مضمون کو حال میں میں نے نظم بھی کیا ہے ارشاد ہوا سناؤ۔ میں نے اپنا یہ شعر پیش کیا ؎

کچھ طبیعت درد کی خوگر ہے، اے درد آفریں!
کچھ مشیت سے تری مجبور ہوا جاتا ہوں میں

غرض بقیہ گانے والیاں بھی خاص مصاحبوں کے پاس بٹھائی گئیں۔ نائکائیں بوڑھے مصاحبوں کے حصے میں آئیں۔ پیا اور کیرلیو بھی اس لطفِ خاص سے محروم نہ رہے۔ اگرچہ کیرکیو فیل بہت لائے، مگر ایک نائکہ اشارہ پاتے ہی خود جھپٹ کر ان کے پہلو میں بیٹھ گئیں اور ان کو بھی اس عطیہ قسمت کو صبر و شکر کے ساتھ منظور ہی کرنا پڑا۔ اس لطیف مذاق سے عید کا لطف زیادہ بر زیادہ ہو گیا۔

اب قالین کے فرش پر لے دے کے ایک نائکہ باقی رہ گئی جو کسی زمین دار کی بھینس کی طرح موٹی بھاری اور ناتراشیدہ کندے کی طرح بدشکل اور بدہیئت تھی۔ پرنس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اسے کس کے پہلو میں جگہ دیں۔ یہ صورت حال دیکھ کر مجھ میں تاب ضبط باقی نہ رہی۔ میں نے دست بستہ عرض کیا، سرکاران معظمہ کا بھی کوئی بندوبست فرما دیں۔ پرنس نے فرمایا، بولو بولو۔ میں نے آنکھ سے ڈھمک جنگ کی طرف اشارہ کیا۔ ڈھمک جنگ جل کر بولے "مناسب

ہوگا کہ آپ ہی اپنے دوسرے پہلو میں ان کو بھی جگہ دیں۔ پرنس کو لطف آگیا ہنستے ہوئے اٹھے اور اس بوڑھی بھینس کو پکڑ کر ڈھمک جنگ کے پہلو میں بٹھا دیا۔ اس دل لگی پر ملک جنگ بھی مسکرا دیئے۔

اب طبلے پر تھاپ پڑنے لگی اور باہر سے آئے ہوئے مہمان اپنا اپنا کمال دکھانے لگے۔ ان مہمانوں کو بھی عید کا جوڑا پرنس کی سرکار سے عطا ہوا تھا۔ گانے والیوں کو ہزار ہزار کی ساری مع بلاؤز، ساتھیوں کو سو سو روپے کی شیروانیاں۔ آج ان سنگیتوں کی سوئی ہوئی تقدیر ساری عمر میں پہلی بار جاگی تھی۔ ان شیروانیوں کو پہن کر پھولے نہ سماتے غرض رات کب گزری، کسی کو پتہ بھی نہ چلا۔ صبح کی اذان کی آواز سن کر ساز موقوف ہوئے۔ مصاحبوں کو حکم ہوا "ہاتھ منہ دھو ڈالو" اب ناشتہ کر کے اپنے اپنے گھر جانا۔

وہ نہاری جو پرنس کے باورچی نے خاص اہتمام سے تیار کی ہو یقیناً خوش ذائقہ ہوگی، مگر رات بھر کی بیداری اور اس کی تکان سے مجھے تو معلوم ہوا کہ نیم کی پتیاں چبا رہا ہوں۔ ہر نوالہ حنظل کے پھل سے زیادہ کڑوا اور بدمزہ معلوم ہوتا تھا۔

انھیں عیش رانیوں اور عشرت ارزانیوں میں دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں اس سرعت کے ساتھ تبدیل ہو رہے تھے۔ جیسے دنوں کے پر لگ گئے ہوں۔ فانی انجام سے غافل مستقبل سے بے پروا مصاحبت کے بحر ناپیدا کنار میں ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ یکایک بیگم فانی علیل ہو گئیں، اب معالجے کے لئے روپے کی شدید ضرورت محسوس ہوئی۔ مہاجنوں سے سودی قرض لینا پڑا۔ ادھر ان کی بیماری

میں اشتداد پیدا ہو گیا، حتیٰ کہ سال بھر میں وہ چارپائی سے لگ گئے اس وقت ڈاکٹروں نے صاف صاف بتا دیا کہ مریضہ کو سرطان ہے۔ اس موذی مرض کے علاج کے لئے پھر روپیہ درکار تھا جس کا کوسوں پتا نہ تھا۔

مجبوری کا دوسرا نام صبر ہے۔ عطائیوں کی دوا ہونے لگی، جس میں دو ہی چار پیسوں کا صرف تھا۔ اس سے فائدہ نہ ہوا تو فیروز علی خاں، فانی کے چھوٹے صاحبزادے، اسپتال سے دوا لانے لگے۔ مہینوں اسپتال کی دوا ہوئی۔ فانی حسبِ معمول دربار داری کرتے رہے اسی زمانے میں کبھی کبھی پرنس فانی سے ان کی بیگم کا مزاج بھی پوچھتے رہے فانی عرض کرتے، حالت اچھی نہیں، معلوم نہیں فدوی کی یہاں سے واپس جا کر انھیں زندہ بھی پاتا ہے یا نہیں۔ اسی پر یہ ذکر ختم ہو جاتا۔ یہاں تک کہ محرم کا مہینہ آگیا اور بارہ دن کے لئے تمام دفاتر اور مدارس بند ہو گئے۔ محرم کی ساتویں تاریخ کو میں نہا کر غسل خانے سے نکلا ہی تھا کہ شیام صاحب تشریف لائے اور انھوں نے یہ اطلاع دی کہ کل رات کو بیگم فانی کا انتقال ہو گیا، جنازہ تیار ہے میں شیروانی پہن کر فوراً فانی کے گھر گیا، جو میرے گھر سے پانچ منٹ کی راہ تھا جنازہ جب قبرستان پہنچا تو میں نے ان آدمیوں کو شمار کیا جو جنازے کے ساتھ تھے۔ مرحومہ کے دونوں لڑکوں اور فانی کو ملا کر کل تیئیس ۲۳ آدمی تھے۔

قبرستان میں میں نے فانی سے دریافت کیا کہ آپ نے اپنے احباب کو اس سانحے کی اطلاع نہیں کی؟ فانی نے کہا، کیوں نہیں

تڑکے ہی مہاراجا کشن پرشاد کو، پرنس کو، امک جنگ کو، ڈھمک جنگ کو ٹیلیفون پر اطلاع دے دی تھی۔ جان بوجھ کر یہ لوگ تغافل برتیں تو اس کا کیا علاج۔

پہلی مرتبہ مجھے فانی کی اس کمزوری کا پتا چلا کہ وہ بدقسمتی سے اپنے احباب میں صرف خطاب یافتہ عہدے داروں یا شہر کے امرا اور روسا کا ہی شمار کرتے ہیں جو صرف محفلوں یا اپنے گھروں پر محض ان کے کلام پر واہ واکرنے ہی کے ذمے دار ہیں۔ اس سے زیادہ فانی سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے۔ مگر وہ موقع بات چیت کا نہ تھا، میں خاموش ہو رہا۔ بارہ بجے دن کو بیگم فانی کی تدفین کے بعد جب ہم لوگ فانی کے گھر پہنچے اس وقت اس خطاب یافتہ عہدیداروں کی طول طویل فہرست سے نواب نثار یار جنگ مزاج ایک صاحب تعزیت کے لئے تشریف لائے، وہ بھی اس بنا پر کہ وہ اپنے عہدے سے ریٹائر ہو کر خانہ نشین ہو چکے تھے اور شہر میں ان کا کوئی خاص وقار باقی نہ رہ گیا تھا۔ اپنے محلے میں بھی وہ ایک عام شہری کی حیثیت رکھتے تھے۔

اسی وقت قاضی عبدالغفار صاحب اپنی موٹر پر آئے۔ انھوں نے فانی اور ان کے لڑکوں کو منہ ہاتھ دھلوایا۔ پانچ سات آدمیوں کا کھانا اپنے ساتھ لائے تھے۔ دسترخوان بچھوا کر ان غریب الوطن ماتم داروں کو اپنے سامنے کھانا کھلوایا۔ قاضی صاحب پیکر اخلاص ومحبت تھے۔ ان کو فانی نے سانحے کی اطلاع تک نہ دی تھی۔ کاش اسی واقعے سے فانی آئندہ کے لئے سبق لیتے اور ان ظاہر دار خطاب یافتاؤں

کا نام اپنے احباب کی ناکار فہرست سے کاٹ دیتے، بلکہ اس فہرست ہی کو جلا کر اس کی راکھ کو ہوا میں اڑا دیتے۔ مگر ان کی قسمت میں تو اس سے زیادہ مصائب برداشت کرنے تھے۔ وہ فہرست جوں کی توں ان کے صفحۂ دل پر جلی حرفوں میں لکھی ہوئی موجود رہی۔

کاش فانی کی دردناک کہانی سے دوسرے ناتجربہ کار لوگ فائدہ اٹھائیں اور امیروں اور عہدیداروں کے ظاہری اختلاط سے دھوکا نہ کھائیں۔ کسی حکیم کا یہ مقولہ آبِ زر سے لکھوا کر پاس رکھنے کے قابل ہے ۔۔۔ "بیچارہ کسے کہ در صحبتِ جبّاراں درماند۔"

سوّم کے روز پرنس کی طرف سے ایک چوبدار یا اسی حیثیت کے کسی ادنئے ملازم نے آکر رسمِ تعزیت ان الفاظ میں ادا کی۔

"سرکار نے فرمایا ہے مجھے تمہاری بیگم کے انتقال کی خبر سُن کر افسوس ہوا۔"

اسی سہ پہر کو یمین السلطنت مہاراجا کشن پرشاد بہادر صدرِ اعظم کا شقہ آیا جس میں درج تھا کہ مہاراجا بہادر اس سانحے پر رنج و ملال فرماتے ہیں۔ مغرب کے قریب ڈھمک جنگ آئے، انھوں نے اظہارِ حزن و ملال کیا مگر تصنع ایک ایک لفظ سے ہویدا تھا۔ املک جنگ نے اس کی بھی ضرورت نہ سمجھی۔ غالباً یہ سوچا ہوگا کہ ہل فورٹ میں جب ملاقات ہو گی تو پرسا بھی دے دیں گے۔

ان معزز احباب کے علاوہ نہ کسی نے تعزیت کا خط لکھا نہ کوئی پرسے کو آیا۔ طبقۂ اوسط کے احباب آتے اور فانی کی دل جوئی کرتے رہے مگر ان کے آنے سے فانی کو کیا تسکین ہوتی؛ وہ موٹر نشینوں کے منتظر رہے،

جو خود فانی کی میت میں بھی تشریف نہ لائے، یہ تو بیگم فانی کی تعزیت کا معاملہ تھا۔

مہاراجا بہادر فانی کی طویل غیر حاضری سے رنجیدہ خاطر تھے، ورنہ اس موقع پر ان کی طرف سے اے ڈی سی آتا اور وہ تجہیز و تکفین کے نام سے پانچ سو روپے بھی بھجواتے۔ یہ سیر چشمی انھیں کی ذات تک محدود تھی، انھیں پر ختم ہو گئی۔ ان کے علاوہ دکن میں کوئی امیر اہلِ ادب کا اصلی معنوں میں قدردان نہ تھا۔ دوسرے اُمرا محض شاعر کی تعریف و توصیف ہی کو اس کی قدر افزائی جانتے اور اس کی بقا کے لیے کافی سمجھتے تھے۔ حالانکہ دولت کے اعتبار سے متعدد امرا مہاراجا بہادر کی حیثیت سے بیس گنی حیثیت کے مالک تھے، مگر ان کی دولت زنانِ بازاری کے لئے وقف تھی۔ ریس میں جا کر لاکھوں اڑاتے، نام و نمود کے لئے ہزاروں خرچ کر دیتے۔ مگر کسی بیوہ کی بے کسی یا یتیم کی حالتِ زار پر کبھی ترس نہ کھاتے۔

دکن کے ایک بہت بڑے امیر جن کے دسترخوان پر دونوں وقت پچیس تیس مرغ ذبح ہو کر کام و دہن کی لذت بڑھاتے تھے، ان کی محفل فحاشی اور ہرزہ سرائی کے لئے مشہور تھی۔ جو مصاحب جس قدر فحاشی کرتا اسی قدر اس کی منزلت بڑھتی۔ خود گالیاں دیتے اور گالیاں کھا کر خوش ہوتے اور جو شرمناک باتیں ان کی محفلوں میں ہوتی تھیں، تہذیب کی زبان ان کے تفصیلی بیان سے قاصر ہے۔ وہ سفید پوش گنڈے جو اُن کی ہم صحبت اور ہم نشین تھے موٹریں اڑاتے پھرتے تھے اور فانی اور یگانہ چنگیزی اپنی اپنی زندگی سے بیزار تھے۔

بیگم فانی کا ہنوز کفن بھی میلا نہ ہوا ہوگا کہ فانی ہل فورٹ کے مشاعروں میں آنے جانے لگے، جو کوئی مزاج پرسی کرتا تبسم کے ساتھ کہہ دیتے:

"پھر وہی زندگی ہماری ہے"

آج فانی بالکل آزاد تھے۔ رات بھر جاگتے، دن بھر طبیعت کو سنبھالنے کی خاطر ہسپتال کی دوا پیتے۔ گھر پر پرہیزی کھانا کھاتے، رات کے ڈنر میں ہر قسم کی بدپرہیزی کرتے۔

ناگہانی فانی کے بعض مار آستین دوستوں نے جو خود بھی تک بندی کر کے مشاعروں کی صفِ اوّل میں اپنا شمار کرتے تھے اور آبی دنیا میں کوئی وقار باقی نہ رکھتے تھے، مہاجنوں سے ساز باز کر کے ان کو اس بات پر آمادہ کیا کہ فانی کو قرض کی علت میں جیل بھجوا دیں۔ آخر ان شیاطین کی ریشہ دوانیاں رنگ لائیں اور دو چار مہاجن اس شیطانی کام پر آمادہ بھی ہو گئے۔ فانی پر بیک وقت متعدد دعوے دائر ہوئے اور یہ خبر فانی کے احباب میں عام ہو گئی کہ فانی قرض کی علت میں عن قریب جیل جانے والے ہیں۔ اس مصیبت کے وقت پھر قاضی عبدالغفار ہی کام آئے۔ انھوں نے نواب ہوش یار جنگ (ہوش بلگرامی) سے تنہائی میں گفتگو کی گفت وشنود کے بعد طے یہ پایا کہ فانی کو جیل سے بچانا چاہئے۔ قاضی صاحب نے ایک ایک قرض خواہ سے فرداً فرداً ملاقات کی۔ ان کو سمجھایا کہ فانی کو جیل بھجوانے سے تمہارا روپیہ تو وصول ہونے سے رہا بلکہ الٹے اخراجات بھی تمہیں باضابطگی سے ماہ بہ ماہ علحدہ ادا کرنے پڑیں گے۔ ایسا کام جس کا کوئی حاصل نہ ہو خلافِ دانائی ہے۔ ان فضول کام سے تو یہ

کہیں بہتر ہے کہ ہم سے معاملت کرو، ہم کچھ نہ کچھ تم کو زرِ اصل سے دلوادیں گے۔ یہ بات مہاجنوں کی سمجھ میں آگئی، اور اب قاضی عبدالغفار صاحب کے دو تین گھنٹے روزانہ مہاجنوں کے ساتھ گل غپ میں گزرنے لگے۔ کم و بیش ایک ماہ کے اندر قاضی صاحب نے ہوش صاحب کی مدد سے وہ سارا قرض بے باق کردیا۔ زرِ اصل اور سود در سود ملا کر سات ہزار سے اوپر قرض تھا۔ آدائی یوں ہوئی کہ جس نے ایک ہزار دیا تھا اُسے پانچ سو دے کر راضی کرلیا گیا اور اس طرح اس ناپاک قرض سے فانی کی گلو خلاصی ہوئی۔ قاضی صاحب کی اَن تھک کوششوں اور ہوش صاحب کے اثر و رسوخ سے مہاجنوں نے ڈر کر جو مل گیا قبول کرلیا۔

اور یہی وہ تنہا ذلت تھی جو آخر وقت یعنی موت سے پہلے فانی کے حصے میں نہیں آئی۔ فانی جیل جانے سے بچ گئے۔ ان غیبی فرشتوں یعنی ہوش اور قاضی صاحب سے فانی کی معمولی یاد اللہ تھی گہرا دوستانہ یعنی قریبی تعلقات نہ تھے۔ گہرے تعلقات والے اُن نازک لمحات میں اپنی کوٹھیوں میں آرام دہ صوفوں پر بیٹھے ہوئے فانی کی بدقسمتی پر اظہارِ افسوس سے زیادہ کچھ نہ کر سکے۔ حالانکہ اگر وہ اپنی تعیش کی زندگی سے صرف ایک مہینے کی شراب کی رقم کو روک دیتے تو فانی ادبار و نکبت کے اس عمیق غار میں گرنے سے بچ جاتے، جس میں ان کی بدقسمتی اور نا سمجھی انھیں کشاں کشاں لیے جا رہی تھی۔ قرض کا تصفیہ رفع دفع ہونے کے بعد ہوش صاحب کی یہ رائے تھی کہ اب فانی کو اپنے وطن واپس جانا چاہیے۔ اس شہر میں جہاں اہلِ ادب کا کوئی پرسانِ حال نہیں ہرگز نہ ٹھہرنا چاہیے۔ یہ کام بھی ہوش صاحب

نے قاضی صاحب ہی کے سپرد کیا، اور قاضی صاحب نے پھر اُسی دوڑ دھوپ اور سرگرمی سے اپنا کام شروع کر دیا۔ بڑی بحث مباحثے کے بعد فانی وطن کی واپسی پر راضی ہوئے۔ اسباب بندھنے لگا۔ ایک شام کو فانی بادل نخواستہ اس مکان سے جس میں مرنا مقدر ہو چکا تھا، آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے رخصت ہوئے۔ خاص خاص دوستوں نے رخصتی معانقہ کر کے انھیں خدا حافظ کہا، مگر جس وقت سکندر آباد ریلوے اسٹیشن پر پہنچے تو گرینڈ ٹرنک ایکسپریس جس پر جانا چاہتے تھے، ان کو بے یار و مددگار چھوڑ کر دھواں اڑاتی نظروں کے سامنے سے بیگانہ وار نکل گئی۔

نوکری سے انکار

ریل کی یہ بے اعتنائی دیکھ کر فانی کا دل ٹوٹ گیا، سمجھے کہ وطن کی واپسی قدرت کو منظور نہیں۔ ہمیں یہیں رہنا، جبر سہنا اور یہیں مرنا ہے یہ سفر بھی مارے باندھے کا ایک سودا تھا، جو محض قاضی صاحب کے مضبوط دلائل سے عاجز آ کر فانی نے منظور کیا تھا۔ ریل کا چھوٹ جانا اونگھتے کو ٹھیلنے کا بہانہ ہو گیا۔ مجبوری اور ناخوشی سے گھر چھوڑا تھا، شاد و شاداں واپس آئے۔ آتے ہی لڑکوں سے کہا کہ اسباب کھول دو، بس اب نہ جائیں گے۔ قاضی صاحب کو یہ حال معلوم ہوا تو دوڑے ہوئے آئے اور سارا حال سُن کر سناٹے میں آ گئے۔ فانی نے کہا "قاضی صاحب! اب ہمیں ہمارے

حال پر چھوڑیئے، تقدیر سے لڑنا آدمی کے بس کی بات نہیں۔" قاضی صاحب خاموش ہو گئے۔ مجھے علم نہیں کہ ہوش صاحب کو یہ رپورٹ قاضی صاحب نے کن لفظوں میں دی، اور انھیں سارا حال سُن کر کیا کہا۔ مگر دونوں کے دونوں اپنی اپنی جگہ ایسے چُپ ہوئے کہ پھر کبھی اس کا ذکر ہی نہ آیا۔
رات کو حسبِ معمول موٹر آئی اور فانی مجھے لیتے ہوئے ہل فورٹ پہنچے۔ ڈنر ٹیبل پر بیٹھے تو میرے علاوہ یہ راز کسی اور کو معلوم نہ تھا کہ اگر اتفاق سے ٹرین مل گئی ہوتی تو فانی ہمیشہ کے لیے "دربار، دربار" کو خیرباد کہہ چکے تھے۔

فانی کو دربار سے گہری وابستگی تھی۔ اور ان کا یہ تعلق خاطر بے جا بھی نہ تھا۔ شہزادہ دکن کی خدمت میں باریابی ہی بڑے فخر کی بات تھی، نہ کہ ان کا ہم نوالہ و ہم پیالہ ہونا۔ پھر دربار کے اندر دل کشی کے اتنے سامان اکٹھا تھے، جو قسمت والوں ہی کے حصّے میں آتے ہیں۔
رہ گیا منفعت کا سوال، اس کا جواب شافی میری طرف سے یہ ہے کہ فانی کے ستارے ہی آخرِ عمر میں بہت خراب تھے، بلکہ عجب نہیں کہ ذہو چار ہبوط میں رہے ہوں، کیونکہ تقدیر ہر کام میں مخالفت کرتی رہی۔ یہ بات نہ ہوتی تو وہ منصفی ہی سے کیوں انکار کرتے جس کے لیے وہ "دِل کوالی فائیڈ" تھے۔

فانی کی پہلی غلطی تو یہی تھی کہ انھوں نے منصفی قبول کرنے سے انکار کیا۔ ایسی حکومت کی ملازمت جیسی حیدرآباد کی منصفی تھی ملتی کیسے ہے۔ دوسری سخت اور فاش غلطی اُن کا اسراف تھا، جس کے وہ عادی معلوم ہوتے تھے۔ مثل مشہور ہے کہ آدمی چادر

دیکھ کر پاؤں پھیلاتا ہے۔ انھوں نے چھوٹی سی چادر میں پورے پاؤں
پھیلا دیئے۔

سمجھنے کی بات ہے کہ ڈھائی سو تا چار سو کے گریڈ میں سیکڑوں
ہی آدمی خاص شہر میں تعلیمات اور یونیورسٹی کے اندر کارگذار تھے۔
ہر شخص کے ساتھ اس کے بال بچوں کا خرچ تھا۔ پھر کسی اور کو ان مشکلات
کا سامنا کیوں نہ ہوا، جن سے فانی کی زندگی ان کے لئے وبال ہو گئی۔ جواب
نہایت واضح اور صاف ہے کہ ہر شخص کے اخراجات اُس کی آمدنی کے
اندر تھے اور فانی کے یہاں خرچ کا کوئی اندازہ ہی نہ تھا۔ پھر افراط و
تفریط تو ہر حال میں بُری ہوتی ہے۔ جوش کی ملازمت کی ابتدا بھی اسی
گریڈ سے ہوئی تھی جس پر کم و بیش وہ دو برس کارگزار رہے۔ وہ
کیوں قرض کے وبال میں نہ پھنسے۔ انھوں نے بھی برسوں پرنس کی مصاحبت
کی، نہ کبھی پرنس ان سے مسلوک ہوئے، نہ جوش نے ان سے اس طرح
کی توقع ہی رکھی تھی۔

اعزازی مصاحبت کے معنے ہی یہ ہیں کہ دربار سے مصاحب کو
کوئی مالی امداد نہیں ملتی، بلکہ پوچھئے تو ہم لوگ جن کا تعلق جونیر پرنس کے
دربار سے تھا، بادشاہ و ذی جاہ کے مصاحبوں سے کہیں بہتر تھے۔ کیونکہ
ہم لوگ ڈنر پرنس کے ساتھ کھاتے تھے، آرام دہ صوفوں پر بیٹھتے تھے، ہمیں
[illegible] بیٹھنے کی اجازت تھی، ہم قیمتی سے قیمتی سگریٹ اور سگار پیتے
تھے، ہمیں عید کی قیمتی شیروانیاں ملتی تھیں، دربار میں چشم و نظر کی
تسکین کے وہ وہ سامان مہیا تھے، جن سے بہتر اس دنیا میں تو ممکن نہیں
یہی حال گوش و سامعہ کی دعوت کا تھا، ہمارے لئے ہر رات شبِ برات

سے زیادہ سہانی اور خوشنما آتی تھی۔

شاہ فلک بارگاہ کے مصاحبوں کو اس آسائش کا ایک عشر عشیر بھی میسر نہ تھا۔ اُن کے کھانے میں ایک ہی ہنڈے آتی تھی، وہ بھی سب کو روزانہ نہیں بلکہ جس دن جس خوش نصیب کی باری آجائے۔ وہ ناشتہ کر کے گھر سے جاتے تھے، دوپہر کا کھانا گھر آ کر کھاتے تھے۔ یہی صورت دوسرے وقت کی مصاحبت کی تھی۔ چائے گھر سے پی کر دربار میں گئے مغرب سے پہلے رخصت مل گئی کہ شام کا کھانا اپنے گھر کھائیں، بیٹھنے کے لئے ان کو کبھی ایک تپائی بھی نصیب نہ ہوئی۔ جس طرح مقام عرفات سے بعض چیزیں حاجیوں پر حرام ہو جاتی ہیں، بلا تشبیہہ یوں ہی آرام و آسائش کی تمام چیزیں شاہی درباریوں کو آستانۂ مبارک پر پہنچنے کے بعد حرام ہو جاتی ہیں۔ چوں کہ ان میں سب کے سب امیر ابنِ امیر ہوتے تھے، جنھیں بچپن میں استاد اُن کی شخصیت کی وجہ سے بنچ پر کھڑا نہ کر سکا تھا، وہ سزا قدرت جوانی کے بعد دربار شاہی میں پہنچا کر انھیں اس طرح دلواتی تھی کہ شاہِ عرش جاہ کے سامنے درباری لباس میں پہروں کھڑے رہتے تھے۔ بتقاضائے فطرت کھانسی آنے پر بضد ہے، مگر کھانا آدابِ دربار کے خلاف ہے کھانس نہیں سکتے، دم روکے کھڑے ہیں، گلا گھٹا جا رہا ہے، لیکن دم نہیں مار سکتے۔ کھجلی بُری طرح ستائے ہوئے ہے، مگر کھجانا دربار میں جائز نہیں، کھجا نہیں سکتے۔ حوائج ضروریہ پر انسان و حیوان کسی کو قابو نہیں جس کو جس وقت ضرورت محسوس ہو، مگر یہ درباری وہ بندگانِ مجبور ہیں کہ اس پر بھی قادر نہیں۔ جب دربار سے چھوٹیں گے دیکھا جائے گا۔

پیٹ میں ریاح ہل چل مچائیں یا قولنج کا درد پڑے مگر منہ سے اُف تک نہیں کر سکتے۔ اتنا بھی تو ان کے امکان میں نہیں کہ کھڑے کھڑے ایک پاؤں ہی کو اٹھا لیں۔ اسی لیے جب دربار سے چھوٹتے تو وہ راحت محسوس کرتے تھے، جیسی راحت شاید ہی کبھی کسی مزدور کو مزدوری سے چھوٹنے کے بعد محسوس ہوئی ہو۔ بات میں بات نکلتی ہے۔ اس ضمن میں ایک لطیفہ سنئے۔ ایک شام کو میں کاچی گوڑہ اسٹیشن سے بائیسکل پر واپس آرہا تھا، سر راہ نواب منظور جنگ کا مکان تھا۔ اتفاق سے نواب ممدوح سامنے ہی برآمدے میں مونڈھے پر بیٹھے تھے۔ دور ہی سے صاحب سلامت ہوئی۔ میں عرصے سے ملا بھی نہ تھا، کوٹھی کے اندر چلا گیا۔ پاس جاکر کیا دیکھتا ہوں کہ ایک خادم اُن کے پاؤں نواڑ سے کس رہا ہے۔ گمان گزرا کہ شاید کوئی سخت عارضہ لاحق ہوا ہے۔ خیر و عافیت پوچھی تو انھوں نے کہا "الحمدللہ اچھا ہوں"۔ میں نے پاؤں کسوانے کا سبب دریافت کیا تو ہنس کر کہنے لگے "ابھی ابھی دربار سے چھوٹا ہوں۔ تین گھنٹے مسلسل کھڑے کھڑے پنڈلیوں میں تشنج پیدا ہو گیا۔ نواڑ کی یہ بندش اسی تشنج کا علاج ہے۔" اس دریافت پر میں ہنسنے لگا تو خود بھی ہنسنے لگے پھر بولے کہ "دو وقت کی یہ مقررہ مشقت اب ناقابل برداشت ہو گئی ہے، مگر کاتبِ تقدیر کا لکھا آدمی مٹا بھی تو نہیں سکتا۔"

منظور جنگ، دہلی یا اس کے قریب وجوار کے رہنے والے اور بے حد دلچسپ انسان تھے۔ بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق کے مخلص دوستوں میں اُن کا شمار تھا۔ ملازمت کے زمانے میں کسی ضلع کے تعلقدار اوّل (کلکٹر) تھے۔ منظور احمد نام تھا۔ ہنوز خطاب سے سرفراز نہ ہوئے تھے، اس لئے دستخط کرتے وقت صرف، منظور لکھنے کی عادت تھی۔ اس دستخط نے ان کی کلکٹری

کے زمانے میں عجیب عجیب پیچیدگیاں پیدا کیں۔ مثال کے طور پر انھوں نے کسی کاغذ پر دستخط کیے۔ سائل پیش کار سے کہتا ہے "میری درخواست پر منظوری کا حکم موجود ہے۔ احکام میرے موافق جاری کیجیے۔" پیش کار کہتا "بھائی! یہ تو بڑے صاحب کے دستخط ہیں۔ حکم تمھارے خلاف لکھا۔" بالآخر دونوں جھگڑنے لگتے۔ جب آئے دن اس قسم کے جھگڑے پیش آنے لگے تو منظور جنگ رفع فساد کی خاطر اپنا پورا نام منظور احمد خاں لکھنے لگے۔

فانی کی تیسری غلطی مہاراجہ بہادر کے یہاں کی حاضر باشی میں کمی تھی۔ اگر فانی ان کے یہاں کی حاضر باشی میں کمی نہ کرتے تو مہاراجا ایسے پابندِ وضع اور مروّت کے پتلے تھے کہ فانی کا مقرّرہ الاؤنس کبھی بند نہ کرتے مگر باوجود نیک نفس اور بے شمار خوبیوں کے، جن کی وجہ سے وہ تمام دکن کے امرا میں ممتاز تھے، تھے تو آخر انسان ہی۔ جب انھوں نے فانی کو اپنی طرف سے بے پروا دیکھا تو دو سو ماہانہ کا وہ الاؤنس جو ان کی سرکار سے فانی کو ماہ بہ ماہ اب تک ملے جاتا تھا، بند کر دیا۔

اب فانی کی کوئی مقررہ آمدنی نہ رہ گئی۔ لے دے کے ہیڈ ماسٹری کی وہی نصف تنخواہ تھی جو رخصت کے زمانے میں الاؤنس رخصت کے نام سے کبھی چھٹے چھ ماہے مل جاتی تھی۔ مگر وہ سب کی سب قرض خواہوں کی نذر ہو جاتی تھی، کیونکہ غلّہ، گوشت، ترکاری، جلانے کا تیل، لکڑی، ہر چیز قرض ہی آتی تھی۔ آفریں ہے ان قرض دینے والوں پر، جو چھ چھ مہینے ضروریاتِ زندگی کی ہر شئے بلا عذر ان کے لئے مہیا کرتے تھے، یا تعریف کے قابل فیروز علی خاں ہیں (فانی کے چھوٹے بیٹے) جو ہر چیز اُدھار لے آتے تھے۔ موٹر اب بھی فانی کے پاس تھی، ڈرائیور کی تنخواہ چڑھتی جاتی تھی، پٹرول

کے دام بھی، جو ہر چیز کی طرح قرض ہی آتا تھا، بڑھتے بڑھتے کئی سو تک پہنچ گئے تھے۔

اس نازک وقت میں نہ جانے کس فرشتۂ غیبی نے اُن کا حالِ زار مسٹر عالم علی خاں علیگ سے بیان کیا، جو اس وقت ہائی کورٹ میں ججی کے معزز عہدے پر فائز تھے۔ وہ فانی کے تمام و کمال حالات سُن کر نہایت متاسف اور بے حد متاثر ہوئے۔ عدالتِ ابتدائی اُن کے سپرد تھی اور کمیشن اسی عدالت سے جاری ہوتے ہیں۔ اُنھوں نے فانی کو کمیشن دینا شروع کیا۔ اِس طرح فانی کو کبھی تین سَو کبھی چار سَو پچیس ملنے لگے۔ مسٹر عالم علی خاں فانی کے دُور کے مدّاحوں میں تھے۔ نہ اُن سے اور فانی سے قریبی تعلقات تھے، نہ آنا جانا یا مِلنا جُلنا تھا۔ یہ ہمدردی اُنھوں نے محض اِس اخوّت کی بِنا پَر کی تھی جو علیگ ہونے کی وجہ سے ہر علی گیرین کو دوسرے بھائی کے ساتھ ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ اس جذبے میں خدا ترسی یا ادب نوازی کو دخل ہو۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اُنھوں نے ایک ڈوبتے ہوئے بے سہارے آدمی کو کچھ دنوں کے لئے غرق ہونے سے بچا لیا۔ اس وقت بھی موقع تھا کہ موٹر نکال دیتے تو ڈرائیور کی تنخواہ اور پٹرول کے مصارف سے بچ جاتے۔ اِس لئے کہ اسکول کی آمد و رفت کا اب سوال ہی نہ تھا اور اسی مقصد کے لئے اُنھیں موٹر کی ضرورت محسوس ہوئی تھی۔ مگر فکرِ انجام تو اُنھیں آتی ہی نہ تھی کمیشن کی یہ آمدنی کوئی مستقل آمدنی نہ تھی۔ جس دن عالم علی خاں صاحب کا عدالت ابتدائی سے تبادلہ ہو جاتا اُسی دن کمیشن موقوف ہو جاتے۔ مگر فانی اس عارضی فائدے پر ایسے مطمئن تھے، گویا وہ کوئی دوامی منصب ہے، جس کے نہ ملنے کا کبھی کوئی اِمکان ہی نہیں۔ یہ وہ سنبھالا تھا جو مرنے سے کچھ

دینہ پہلے ہر بیمار لیتا ہے۔ یا صبح کے چراغ کی یہ وہ روشنی تھی جو بجھنے سے کچھ دیر پہلے زیادہ تیز ہو جاتی ہے۔

نواب شہید یار جنگ شہید جو دکن کے خوش گو شاعر اور صاحب خیر امیر ہیں، اُس وقت دربارِ سلطانی کے رسوخ و اثر سے مرجعِ خلائق بنے ہوئے تھے۔ پرنس بھی اُن پر پورا اعتماد کرتے تھے۔ اُن سے فانی کی خستہ حالی نہ دیکھی گئی۔ اُنھوں نے بار بار پرنس کو توجہ دِلائی، حتیٰ کے پرنس فانی کی امداد پر آمادہ ہو گئے اور ایک دن وقت نکال کے بھائی (ولی عہد سلطنت) کے پاس گئے، جو افواج کے اعزازی سپہ سالار تھے اور نظم جمعیت یعنی فوج بے قاعدہ کا محکمہ بھی انھیں سے متعلق تھا۔ نواب قدرت نواز جنگ، پرنس کے حقیقی ماموں اس وقت نظم جمعیت کے ناظم تھے، اُن کی مددگاری میں دو سَو تا چار سَو کی ایک جگہ اتفاق سے زیرِ انتظام تھی۔ پرنس نے بھائی سے اسی جگہ پر فانی کو مامور کرنے پر سفارش کی۔ بڑے بھائی نے بہ کمالِ شفقت پرنس سے کہا "بھائی جو چیز میرے اختیار کی ہو اس کے تم خود خود مختار ہو، اس میں سفارش کیسی؟ قدرت نواز جنگ سے کہہ دو، وہ فانی کا تقرر کر کے مِسل میرے پاس بھیج دیں، میں منظوری دے دوں گا۔"

ایک بوڑھے شاعر کے لئے یہ جگہ خدائی انعام سے کم نہ تھی۔ گھر بیٹھے چار سو روپے مہینے کا منصب تھا۔ محکمہ ایسا تھا، جس میں خود ناظم کے لئے کوئی کام نہ تھا۔ مددگار کے لئے آرام دہ کمرے میں فرصت سے بیٹھ کر پان کھانے یا شعر کہنے کے علاوہ کیا مشغلہ ہوتا۔ فانی کی بدقسمتی اُن سے اگر یہاں بھی انکار نہ کرواتی، تو ڈنر پرنس کے ساتھ کھاتے تھے، لنچ قدرت نواز جنگ کے ساتھ کھایا کرتے۔ یہ کام ایسا زحمت طلب نہ تھا

جو فانی کے بس سے باہر ہوتا۔ مجھے نواب قدرت نواز جنگ کے ساتھ کھانا کھانے کا اتفاق نہیں ہوا لیکن جس شان سے وہ رہتے تھے اُس سے اس کا اندازہ لگانا کوئی دشوار نہیں کہ پرنس کے اور ان کے خاصے میں تھوڑا ہی سا فرق ہوتا ہوگا۔ فانی ان کی ماتحتی میں آخر عمر تک آسائش سے رہتے۔

یہ واقعہ یعنی پرنس کی مجوزہ جگہ سے فانی کا انکار جس طرح پیش آیا مجھے صرف یہ حرف اسی طرح بیان کرنا ہے۔

ایک دن سہ پہر کو میں بورڈنگ ہاؤس کے حسابات چیک کر رہا تھا، منشی جی (جن پر اللہ کی رحمت ہو) سامنے کھڑے تھے۔ ناگاہ خلافِ معمول ہل فورٹ کی موٹر آ گئی۔ ڈرائیور نے موٹر سے اتر کر اطلاع دی "آپ کی فوراً یاد ہوئی ہے، پانچ منٹ کے اندر تیار ہو جائیے۔ میں فانی صاحب کو لے کر آتا ہوں۔" میں گھبرا کر کرسی سے کھڑا ہو گیا۔ منشی جی کہنے لگے، "آج یہ وقت سے پہلے یاد کیسی؟" میں نے عجلت میں جواب دیا "سرکار غالباً کسی سینما جانے کا قصد رکھتے ہوں گے۔" ٹھیک پانچ منٹ میں فانی آ گئے، اور میں درباری لباس میں ان کے پاس بیٹھ گیا۔ راستے میں میں نے فانی سے کہا، "شاید سرکار آج سینما جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔" فانی بولے "یہ بات نہیں بلکہ یہ قصہ ہی دوسرا ہے۔ آج سرکار نے مجھے نظم جمعیت کی مددگاری کا آفر بھیجا ہے، جسے میں نے نامنظور کیا۔ چونکہ یہ بڑی گستاخی تھی، مجھے اس وقت تنبیہہ کی خاطر بلایا ہے۔" میں نے گھبرا کر کہا، "آپ کو تنبیہہ کی خاطر بلایا ہے تو مجھے کس غرض سے طلب فرمایا ہے؟" فانی کہنے لگے، "تم کو عبرت حاصل کرنے کے لئے، تاکہ تم کبھی اس طرح کی گستاخی کے مرتکب نہ ہو۔" بات یہیں تک پہنچی تھی کہ موٹر ہل فورٹ میں داخل ہوئی۔

ہنوز عصر کا وقت باقی تھا۔ ڈرائیور نے موٹر محل کے بیرونی سیڑھیوں کے قریب کھڑی ہی کی تھی کہ پرنس خود گیلری میں تشریف لے آئے۔ ہم لوگ موٹر سے بہ عجلت کود دے آداب بجا لائے اور ان کے ساتھ ہو لیے۔ پرنس ہم دونوں کو لیے دربار ہال میں پہنچے جہاں اس وقت ہال کے بیچ میں ایک بیش قیمت گول میز رکھی ہوئی تھی۔ میز کی ایک جانب پرنس خود کھڑے ہو گئے، دوسری طرف ہم دونوں تھے۔

ناظرین چشم تصور سے اُس موقع کی تصویر ملاحظہ فرمائیں۔ دن کا وقت ہے، ہم لوگوں اور پرنس کے درمیان صرف ایک میز کا فصل ہے، نہ میں فانی کو کسی طرح کا اشارہ کر سکتا ہوں، نہ انھیں کہنی مار کر کسی غلط بات سے روک سکتا ہوں۔

پرنس: "فانی! مجھے معلوم ہوا کہ تم نے میرے آفر کو ٹھکرا دیا۔"

فانی: "(دست بستہ ہو کر) سرکار! واقعہ یوں ہے کہ میرے لیے یونیورسٹی میں ساڑھے تین سو تا چھ سو روپے کی ریڈری طے ہو چکی ہے۔ اسی مہینے کے آخر میں میرا اُس جگہ پر تقرر ہو جائے گا۔ دو سو تا چار سو کی جگہ قبول کرنے میں میرا سراسر نقصان ہے۔"

پرنس: "کیا یونیورسٹی کونسل نے اپنی کسی میٹنگ میں تمہارے تقرر کا فیصلہ کر لیا ہے؟"

فانی: "نہیں سرکار، یونیورسٹی کونسل نے اس قسم کا ابھی کوئی فیصلہ تو نہیں کیا، مگر مجھ سے ایک مقتدر اور ذمہ دار عہدہ دار نے حتمی وعدہ کر لیا ہے۔"

بے تکا جواب سُن کر جو سراسر دانائی کے خلاف تھا، میرا دل

دھڑکنے لگا۔ مگر اس وقت فانی کی طرف دیکھنے کا موقع بھی نہ تھا۔ میں صورت تصویر پرنس کے سامنے کھڑا رہا۔

پرنس: "آخر اس مقتدا اور ذمہ دار عہدہ دار کا کچھ نام بھی ہے؟"

فانی: (قدرے فخریہ لہجے میں) "نواب مہدی یار جنگ بہادر۔"

اب قریب تھا کہ میں غشل کھا کر گر پڑوں۔ بہ مشکل میں نے اپنے کو سنبھالا کیونکہ میں نواب ممدوح اور اُن کے وعدے کی قدر و قیمت سے بہ خوبی واقف تھا۔ اَدب برائے ادَب کی طرح اُن کا وعدہ بھی وعدہ برائے وعدہ ہوتا تھا۔ سال میں دو ہی ایک وعدے شرمندۂ وفا ہوتے تھے۔ اور ہزاروں وعدے اس تاب ناک خواب کی طرح تھے جو ابتدائی شب میں دکھائی دے اور کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو۔

نواب کا ادبی ذوق شہر بھر میں مشہور تھا' مجھ پر اور جوش پر خاص عنایت تھی' بلکہ ہم دونوں پر ان کے احسانات بھی تھے۔ اللہ تعالیٰ آخرت میں بھی ان کے مدارج ارفع کرے۔ اپنی زندگی بڑی شان و شوکت سے بسر کر گئے۔ دو دو اہم وزارتوں کے قلم دان اُن کے سپرد رہتے تھے۔ وزارتِ سیاسیات' وزارتِ تعلیمات' کبھی وزارتِ فینانس اور تعلیمات اعلیٰ حضرت سلطانِ دکن کے معتمد علیہ تھے۔ جس وقت کا یہ ذکر ہے اس وقت فینانس اور تعلیمات کی وزارت تفویض تھی۔ قابلیت اُن کی ملک بھر میں مستند تھی۔ مگر ساتھ ہی ساتھ ان کی بھول چوک کے افسانے بھی خاص و عام کی زبان پر تھے۔ نہایت خوش مزاج' بذلہ سنج اور لطیفہ گو تھے۔ مجھے پہلی ملاقات میں یہ لطیفہ سنایا تھا' ناظرین بھی لطف اندوز ہوں۔ مدرسۂ اعزہ میں زماں خاں نامی ایک طالبِ علم تھے' جو ہائی اسکول

کا امتحان پاس کر کے اسی مدرسے میں ٹیچر کی حیثیت سے مقرر ہوئے جب کبھی اپنی طالب علمی کا زمانہ یاد آتا اور موجودہ مدرسی کے وقار پر نظر ڈالتے، تو خدا کی قدرت پر وجد کرتے۔ آخر یہ وجدانی کیفیت رنگ لائی اور ایک دن انھوں نے اپنی اُس مجبوری اور مختاری کو ان خوبصورت لفظوں میں نظم کر ڈالا ے

شکرِ خالق کر زماں خاں رات دن....
پہلے تھا مفعول لیکن اب تو فاعل ہو گیا

دوستوں کو ایک دن اپنا یہ شعر سنایا۔ بعض نے تعریف کی بعض مسکرائے' ایک دل لگی باز نے کہا" دوست! شعر لاجواب کہا ہے' مگر پہلے مصرعے میں مجھے ایک رُکن کی کمی محسوس ہوتی ہے" انھوں نے سادگی سے کہا" بھائی وہ کمی تم پوری کر دو" اُس نے کہا" اب جہاں سنانا تو یوں سُنانا۔ ے

شکرِ خالق کر زماں خاں رات دن اُلّو کی دم
پہلے تھا مفعول لیکن اب تو فاعل ہو گیا

اُس برجستہ اصلاح پر احباب ہنستے ہنستے لوٹن کبوتر بن گئے اور زماں خاں اُس ہنسوڑ دوست پر ایسے غضب ناک ہوئے کہ بے چارے نے بھاگ کر بمشکل اپنی جان بچائی۔

نواب کی بھول چوک کا ایک قصہ شہر بھر میں مشہور تھا' جسے ہر چھوٹا بڑا اپنے الفاظ میں دہرایا کرتا تھا۔ عید کے دن نماز پڑھنے گئے' کمسن لڑکا ساتھ تھا' نماز پڑھ کے تنہا گھر واپس آ گئے۔ لڑکا ساتھ آیا تھا' اس کا خیال ہی نہ رہا۔

میں نے اپنے ایک قطعے میں نواب کی بھول چوک کی طرف اس خوبی سے اشارہ کیا تھا کہ سُن کر پھڑک ہی تو گئے۔

عاقلوں کا قول ہے نیکی کر اور دریا میں ڈال
بھُول جانے کی بھی کیا اچھی ہے عادت آپکی

اپنی اس عادت کے مطابق آج جو وعدہ کرتے کل اُسے بالکل بھُول جاتے۔ اہلِ حاجت کا وہ کام جو ایک ہفتے میں نکلتا' برسوں میں نکلتا تھا۔ میں نے اپنے قطعے میں اس تاخیر کا ذمہ داران کی کوٹھی کی بلندی کو ٹھہرایا تھا' جو بنجارہ ہل پر سب سے اونچی کوٹھی تھی۔

آسماں بوس آپ کا ایواں سرکو ہسار ہے
دیکھتا ہے رشک سے کیواں بھی رفعت آپ کی
سعی پیہم کیا کرے کوشش سے ہاتھ آتی نہیں
اس قدر اونچی ہے زنجیرِ عدالت آپ کی

میرے ایک کام میں وہ کرنے کے بعد اپنی عادت کے مطابق ٹال مٹول کر رہے تھے۔ میں نے اپنے ایک شعر میں نواب کو وعدہ دفائی پر اس طرح اکسایا تھا

آپ کے مورث[1] نے وعدے پر دیا ہے اپنا سر
آپ کے وعدے کی ضامن ہے شرافت آپکی

نواب کی قدر شناسی دیکھئے' ایک ایک شعر پر پھڑکے' پورا قطعہ مزے لے لے کے سُنا' بڑی تعریف و توصیف کی اور وہ صلہ دیا کہ میرا دامن گوہرِ مقصود سے

---

[1] مورث سے اشارہ امام حسین علیہ السلام کی طرف ہے۔

بھر گیا۔ ایسے سخن شناس اب دنیا میں کہاں! محض ان کا ذکرِ جمیل باقی ہے، اور عجب نہیں کہ باقی رہے۔

بات کہاں سے کہاں جا پہنچی۔ پرنس نے فانی سے دریافت کیا، کیا مہدی یار جنگ نے تم سے کوئی تحریری وعدہ کیا ہے؟ ہائے ری فانی کی بدقسمتی! پرنس کا صحیح منشا اب بھی نہ سمجھے کہنے لگے "وعدہ تو زبانی ہی ہے مگر تحریری وعدے سے زیادہ معتبر ہے"۔ پرنس نے کہا "بہتر ہے جب تم میرا آفر منظور کرنے میں اپنا نقصان سمجھتے ہو تو وہ کام کرو جس میں تمہارا فائدہ ہو"۔ بات یہیں ختم ہو گئی۔ اس کے بعد پرنس مجھ سے مخاطب ہو گئے اور اِدھر اُدھر کی پُر لطف باتیں ہونے لگیں۔

پندرہ دن بات کرتے گزر گئے اور وہ ساعت نزدیک آ گئی جس کے خوشنما تصور میں فانی نے پرنس کا آفر نامنظور کر دیا تھا۔ فانی شوق کی تصویر بنے ہوئے نواب کی ملاقات کو گئے۔ اس ملاقات کا حال خود انہیں کی زبانی سنیئے:

گیارہ بجے دن کو پہنچا، ملاقات کے کمرے میں بٹھا دیا گیا۔ تیس یا پینتیس ملاقاتی اور ہوں گے۔ بارہ بجے، ایک بجا، اندر سے کسی کی طلبی نہ ہوئی۔ بعض لوگ تنگ آ کر بے ملے چلے گئے، وہی دانا تھے۔ ڈیڑھ بجے کے قریب جمعدار اندر سے نکلا اور یہ اطلاع دی کہ آج نواب صاحب بے حد مصروف ہیں۔ کسی سے ملاقات نہ ہو گی۔ آپ صاحبان پھر کسی دن تشریف لائیں۔ سب ملاقاتی یاس و حرماں کی تصویر بنے ہوئے اپنی نشستوں سے اٹھے، کمرہ خالی ہو گیا۔ خدا جانے میری بے کسی پر خود جمعدار کو رحم آیا، یا نواب ہی نے یہ تخصیص برتی، جمعدار کہنے

لگا" "آپ اندر جائیے، صرف پانچ منٹ کا وقت ہے، جو کہنا ہے جلدی سے کہہ دیجئے گا، ورنہ پھر موقع نہ ملے گا۔" میں اجلاس کے اندر گیا، سلام کیا۔ اُنھوں نے میری طرف دیکھا، نہ سلام کا جواب دیا۔ صرف انگشتِ شہادت سے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں سامنے کی خالی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھا ہی تھا کہ جمعدار نے اطلاع دی کہ خاصہ تیار ہے۔ انھوں نے میری طرف دیکھا اور فرمایا "فانی صاحب! آتش و ناسخ میں آپ کس کو اچھا شاعر سمجھتے ہیں، مضبوط دلائل کے ساتھ ایک پر دوسرے کو ترجیح دیجئے۔"

یہ نواب کی خاص عادت تھی جس کو ٹالنا مقصود ہوتا تھا اس سے یہ سوال ضرور کرتے تھے۔ میری بارات کا پورا لطف جوش اٹھائیں گے، کیونکہ خود انھیں بارہا اس سوال کا جواب دینا پڑا ہے۔ اس کے بعد ہی معاً دوسرا سوال یہ کرتے تھے: "اچھا، طباطبائی صاحب کی شاعری کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟"

ایک دفعہ میں اور جوش ساتھ ساتھ نواب کی ملاقات کو گئے، اور کسی نہ کسی ہی ضرورت سے گئے تھے۔ نواب کام سے گریز کرنا چاہتے تھے۔ جوش کو مطلب کی طرف آتا دیکھ کر کہنے لگے۔ "جوش صاحب آتش اور ناسخ میں آپ کس کو اچھا شاعر سمجھتے ہیں؟" مرتا کیا نہ کرتا، بے چارے جوش نے اپنا کام بنانے کی خاطر وہی پرانا سبق جسے پچاس بار سُنا چکے تھے، از سرِ نو پھر سُنا ڈالا۔ نواب مزے لے لے کے سُنتے رہے، گویا پہلی بار یہ مضمون جوش کی زبان سے سُن رہے ہوں اور خود بھی سمجھنے کی کوشش میں ہوں۔ جوش جب اپنے نزدیک

اپنے بیان سے نواب کی تشفی کر چکے تو انھوں نے بلا تاخیر اپنا دوسرا سوال بھی کر ڈالا " اچھا تو جوش صاحب طباطبائی صاحب کی شاعری کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے ؟ " مطلب سے ایسا صاف اور واضح گریز دیکھ کر جوش جھنجلا گئے ۔ پٹھان ہی جو ٹھہرے ۔ غصے میں اپنی ضرورت کا بھی خیال نہ رہا کہنے لگے " اس مسخرے کو شاعری سے کیا تعلق ؟ دنیا میں اور ہزار کام ہیں جوتا گانٹھنے، پتا خے بنائے ، تھیجے باندھے ، قلعی کرے ، یہ کیا ضرور ہے اگر شعر ہی کہے " نواب اس جوشیلی تقریر کی تاب نہ لاسکے ، کھڑے ہو گئے فرمایا ، اچھا جوش صاحب ! پھر ملاقات ہو گی ۔ اس وقت میں بہت مصروف ہوں " ہم لوگ سلام کر کے باہر نکل آئے ۔ مطلب غت ربود ہوا ، یہی نواب کا منشا تھا ۔ جب موٹر پر بیٹھے تو میں نے جوش کو توجہ دلائی کہ آج آپ کی تقریر نواب کو گراں گزری پوچھا وہ کیوں ؟ میں نے کہا کہ طباطبائی کا وہ بہت احترام کرتے ہیں ۔ جوش کہنے لگے : " ایسی تیسی ایسے احترام کی ، مجھے کیوں دق کرتے ہیں ۔ اچھا تمہیں کہو تم اس مہمل سوال کا کیا جواب دیتے ؟ " میں نے کہا " میں کہتا کیا بات ہے آج ملک میں اس علم و فضل کی دوسری شخصیت نہیں ۔ فرد فرید اور وحیدِ عصر ہیں " جوش بگڑ کر بولے " سوال تو ان کی شاعری کے متعلق تھا " میں نے کہا ، " ہو ، مگر میرا جواب یہی ہوتا ۔ نواب نکتہ سنج اور معنی شناس ہیں ، سمجھ جاتے کہ ان کی شاعری کے مداح نہیں ، مگر علم و فضل کے قائل ہیں " جوش برہمی سے بولے " لعنت بھیجیے ۔ ہمارا کام تو بے شک چوپٹ ہوا ، مگر آج سے مجھ سے یہ سوال بھی نہ کریں گے ۔ نفسِ مضمون سے میں پھر دُور جا پڑا ۔ بات یہاں تک پہنچی تھی کہ

نواب نے فانی سے آتش و ناسخ پر موازنہ کرنے کی فرمائش کی۔ فانی لکھنو کے ان اساتذہ کے رنگِ سخن پر حال ہی کافی روشنی ڈال چکے تو جمعدار کی وہ نصیحت یاد آئی کہ جو کچھ کہنا ہو جلدی سے کہہ دیجیے گا۔ کہنے لگے "پرسوں یونیورسٹی کونسل کی میٹنگ ہے جس میں اعذو کی انتظام طلب جگہ پر تقرر کا مسئلہ زیرِ غور آئے گا میں اسی کی یاد دہانی کے لئے حاضر ہوا تھا۔" نواب نے کمالِ بے اعتنائی سے فرمایا "فانی صاحب! اس جگہ کے لئے مجھے آپ سے بہتر امیدوار مل گیا ہے۔ آپ کے لئے پھر دیکھا جائے گا۔" جیسے وہ خوب صورت خیالی محل جسے فانی ایک مہینے سے تصور میں دیکھ کر خوش ہو رہے تھے یک بہ یک مسمار ہو گیا۔

نواب کھڑے ہو گئے اور فانی سلام رخصت کر کے باہر نکل آئے اسی جگہ کی امید میں فانی نے پرنس کی پیش کش کو نامنظور کر دیا تھا، اب اپنی غلطی پر نادم اور پشیمان تھے، مگر اس جگہ کا بھی انتظام ہو چکا تھا۔ وہ موقع بھی ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ اب انھیں موٹر کے نکالنے کا خیال آیا۔ اپنے اس ارادے کا بھی انھوں نے کسی سے ذکر نہ کیا۔ ایک شام کو موٹر پر بیٹھے اور ہراج خانے (نیلام گھر) میں جا کر نیلامی کے سپرد کر آئے۔ اس نے دریافت کیا، کس قیمت تک آپ نکالنے پر آمادہ ہیں؟ آٹھ سو سے کم ہرگز نہ بیچنا۔

فانی کی ہلکی پھلکی خوبصورت گاڑی ایسی اچھی حالت میں تھی کہ اگر کوڑیوں کے مول بھی بکتی تو آٹھ سو میں سستی ہی سمجھی جاتی مگر فانی کی بدقسمتی وہاں بھی ساتھ ساتھ تھی۔ نیلام کے دن کوئی موٹر کا خواہش مند ہی نہ نکلا تین سو کے اوپر کوئی دام لگانے والا نہ ملا،

موٹر کا نیلام ملتوی رہا۔

نیلامی نے فانی کو واقعے کی اطلاع دے کر ۲ ر آنے فی روپے کے حساب سے تین سو پر اپنا کمیشن طلب کیا۔ یہ مرے پر سو دُرّے تھے فانی ایسے دل تنگ ہوئے کہ دوسرے دن اس سے کہہ آئے جس قیمت پر موٹر بکے بیچ دینا۔ اگلے نیلام میں ایک ہزار مالیت کی موٹر تین سو میں نیلام ہو گئی۔ دونوں نیلاموں کا کمیشن وضع ہونے کے بعد فانی کے ہاتھ جو آیا وہ ڈرائیور کی چڑھی ہوئی تنخواہ کے لئے بھی کافی نہ تھا۔

اب فانی نے مجھ سے اس تازہ مصیبت کا ذکر کیا مگر موٹر نیلام ہو جانے کے بعد عملی ہمدردی کا موقع ہی کیا رہ گیا تھا جس کے لئے میں کوئی دوڑ دھوپ کرتا۔ جو لوگ تقدیر کے قائل نہیں انہیں فانی کی سرگزشت سے سبق لینا چاہئے۔ سعدی علیہ الرحمہ نے کیا خوب فرمایا ہے۔

اگر بہ ہر سرِ مویت ہنر دو صد باشد
ہنر بکار نیاید چو بخت بد باشد

شراب خانہ خراب

عید تو گزر گئی مگر اپنے پیچھے سیکڑوں رعنائیاں دربار میں چھوڑ گئی یعنی ہنوز وہ مہمان جو ہزار ہا روپے خرچ ہونے کے بعد دور دراز مقامات سے اس تقریب سعید کے لئے بلوائے گئے تھے، اپنی مقررہ

قیام گاہوں میں مقیم تھے۔ اُن کی سیر و تفریح کے لئے ٹوٹیکسیاں پرنس کے اشارے پر مقرر ہو گئیں، جو رات دن ان کے دروازے پر حاضر رہتیں۔ ہر ٹیکسی چوبیس گھنٹے کا کرایہ بیس روپے یومیہ کے حساب سے چارج کرتی تھیں۔ صبح کا ناشتہ کر کے یہ سواریاں اس شان سے نکلتیں کہ اگلی موٹر پر سب سے زیادہ حسین مہمان کے ساتھ ہشیام صاحب جسم سے جسم بھڑا کر بیٹھتے۔ شاید اپنے ضعیف و ناتواں جسم کو برق شباب کی گرمی سے گرمانا مقصود ہو۔ اس میں شک نہیں کہ بجلی کے اس بے ضرر علاج کا طریقہ جس قدر اچھوتا اور انوکھا تھا، اتنا ہی زود اثر اور مفید بھی تھا۔ ان کی موٹر کے بعد بقیہ مہمانوں کی موٹریں ہوتیں۔ جس سڑک سے یہ سواریاں گزرتیں، راہ چلتے تصویر حیرت بن جاتے۔ معلوم ہوتا تھا کہ آسمان سے کچھ ستارے سرزمین حیدرآباد کی سیر کرنے اتر آئے ہیں۔ اسی طرح کی ایک سواری کے نظارے سے متاثر ہو کر میں نے اپنے تاثرات کا ان لفظوں میں اظہار کیا تھا:

قطعہ

گل گشت کو نکلی ہیں اس شان سے کچھ پریاں
اندر کے اکھاڑے کا نقشا نظر آتا ہے
تسخیر ملائک کی حاصل ہو جیسے قدرت
اس حسن کا ہر دل پر قبضہ نظر آتا ہے
مصروف تماشا ہے اک سروِ خراماں بھی
بوٹا سا وہ قد کیا، زیبا نظر آتا ہے

نک سُک سے درست ایسا معشوق نہ دیکھا تھا
یارب تیری قدرت کا جلوا نظر آتا ہے
انساں تو کجا، آگے اس صبح لطافت کے
رنگِ گُل نسریں بھی میلا نظر آتا ہے
ہنسنے میں دُرِ دنداں جس وقت چمکتے ہیں
غنچہ سا دہن کتنا پیارا نظر آتا ہے
ہر چند کے مجمعے میں بیگانہ سا ہے سب سے
ہر شخص کو لیکن وہ اپنا نظر آتا ہے

اہلِ حسن کے یہ قافلے بوئے گل کی طرح ایک بجے دن تک آوارہ پھرتے، سہ پہر کو نہا دھو کر دوبارہ نکلتے، رات کے دربار میں جمع ہوتے اور اپنی مقررہ نشستوں پر مصاحبوں کے پہلوؤں میں بیٹھ جاتے۔ بوڑھی بھینس ڈھمک جنگ کا پہلو گرماتی۔ ڈھمک جنگ کئی دن تو اس سے کچھ کھچے کھچے رہے۔ آخر تن بہ تقدیر اور راضی بہ رضا ہو کر باتیں کرنے لگے۔ یہ جلسے مسلسل سات دن رہے اور ان سات دنوں میں قمر طلعت مہمان، ذی قدر میزبان کی فیاضی اور دریا دلی سے اتنا کچھ لے گئے، جو انھیں اپنے دیس میں سال بھر کی محنت کے بعد بھی نصیب نہ ہوتا۔ ایجنٹوں کی جیبیں بھی طلائی اور نقرئی سکوں سے بھر گئیں، جب کہیں عید کا جلسہ برخاست ہوا۔ اس گہما گہمی کے بعد ہل فورٹ مجھے ہفتوں سونا سونا سا معلوم ہوتا تھا:

سونی سونی بزم ہے اُس گل کے اُٹھ جانے کے بعد
پھیکی پھیکی صبح ہے شمعِ سحر کے سامنے

شیام صاحب کے ہاتھ دوڑ دھوپ کے سوا کچھ نہ آیا، البتہ اس طرح کے دس بیس الزامات ان کے سر منڈھے گئے کہ فلاں طائفے کو ناشتہ دیر میں پہنچا، فلاں کوٹھی میں روشنی کا انتظام خراب تھا، لکھنؤ کے طائفے کو کھانا بروقت نہیں ملا، آگرے والوں کو پان بہ دیر پہنچے۔ اس پر ان کا منہ پیٹنا اور اپنے کو کوسنا، الزام دھرنے والوں کے لطف کو دوبالا کر دیتا تھا۔

انھیں دھاکہ چوکڑیوں میں فانی ایک روز مجھ سے کہنے لگے کہ تم نے پرنس کا تقرب تو بہت جلد حاصل کر لیا، مگر میری ایک بات یاد رکھنا کہ اس محفلِ رنگیں میں رہ کر تم سدا صوفی صافی نہ رہ سکو گے۔ ایک دن ایسا آئے گا جلد آئے یا بہ دیر، کہ میں تم کو بھی حریفانِ بادہ پیما کی صفِ اوّل میں بیٹھا دیکھوں گا۔ میں نے ہنس کر جواب دیا کہ تین برس تو اللہ نے مجھے محفوظ رکھا ہے کل کیا ہوگا اس کی خبر نہیں، بر سرِ فرزند آدم ہر چہ آید بگذرد۔ فانی کی اس پیشین گوئی کو مشکل سے ایک مہینہ گزرا ہوگا کہ ایک شام سرکاری موٹر فانی کو لیے بغیر میرے گھر پر رکی۔ میں نے دریافت کیا فانی کہاں ہیں؟ ڈرائیور نے جواب دیا کہ آج تنہا آپ کو یاد فرمایا ہے۔ میں کپڑے پہن کر موٹر میں بیٹھ گیا۔ آج ڈرائیور نے نیا راستہ اختیار کیا اور ہل فورٹ کے بجائے مجھے ایک نئے مکان کے دروازے پر اتارا جو اپنی نفاست اور خوبصورتی سے کسی امیر کا گھر معلوم ہوتا ہے۔ میں نے اندر قدم رکھا تو ایک خوبصورت خادم مسکراتا ہوا آگے بڑھا اور مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے آگے آگے چلنے لگا۔ کئی آراستہ کمروں کو طے کرنے کے بعد ہم دونوں ایک مختصر سے صحن میں پہنچے، جہاں ایک خوب صورت شطرنجی پر چار ہاف ایزی چیر (جو اپنی پالش کی وجہ سے

آئینے کی طرح چمک رہی تھیں، سلیقے سے بچھی ہوئی تھیں۔ صدر کی کرسی پر پرنس رونق افروز تھے۔ ان کی بائیں طرف دوسری کرسی پر میں نے ایک نازک اندام پری جمال حسینہ کو دیکھا جس کے حسن وجمال کی لفظوں میں تصویرکشی کرنا میرے بس کی بات نہیں۔ شاید یہ بند ناظرین کے اشتیاق کی پیاس کسی قدر بجھا سکے ۔

فطرت نے نقشِ ناز بنانے میں لئے حسین
گلشن لٹا دیا گلِ رخسار کے لئے
رنگِ چمن نچوڑ کے صورت میں بھر دیا
جو پھول بچ گئے وہ دیئے ہار کے لئے

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دستِ قدرت نے یہ تصویر خاص دلچسپی سے بنائی ہے۔ سامنا ہوتے ہی میں پرنس کے حضور درباری آداب بجا لایا، پھر ادب سے اُسی جگہ کھڑا ہو گیا۔ پرنس نے مجھ سے بہ لطف فرمایا" صدق! بمبئی کے ایجنٹ سے تم بخوبی واقف ہو اُسی نے مجھے یہ تحفۂ نایاب بھیجا ہے۔ میں نے تم کو حسن کا نقاد جان کر سب سے پہلے یاد کیا ہے اور تمہاری رائے سننے کا مشتاق ہوں"۔ میں نے دست بستہ عرض کیا ۔

خدا آباد رکھے ہم صفیرانِ گلستاں کو
جو کوئی پھول کھلتا ہے تو ہم کو یاد کرتے ہیں

فرطِ مسرت سے پرنس کا چہرہ دمکنے لگا۔ اس حسینہ سے فرمایا" یہ ہمارے دربار کے شاعر صدق جائسی ہیں۔ دیکھو حسبِ موقع کیا شعر پڑھا ہے" اس نے بھی مجھ پر لطف آگیں نظریں ڈالیں اور بڑے ناز و ادا سے سلام

کے لئے ہاتھ اٹھایا میں نے دونوں ہاتھ سینے پر رکھے سر جھکایا۔ اب پرنس نے میری ذہانت، ذکاوت اور رنگینی کلام کی تعریف و توصیف شروع کر دی۔ کاش پرنس مجھے بیٹھنے کا حکم دیتے اور جس قدر میری تعریف فرمائی اُس کا سواں حصہ بھی توصیف میں نہ صرف کرتے۔ مگر وہ بیٹھنے کی اجازت دینا شاید بھول گئے۔ میں از خود بیٹھ نہ سکتا تھا۔ یہ بات آداب دربار کے خلاف ہوتی۔ ان کے ہر تعریفی جملے اور توصیفی فقرے پر مجھے سات سات سلام علیحدہ کرنے پڑے۔ کھڑے رہنے کی سزا کیا کم تکلیف دہ تھی، اُس پر سلاموں کی مصیبت۔ میں جان سے بیزار تھا مگر "آن پھنسا سو آن پھنسا" کا مصداق، نہ اپنی جگہ سے ہٹ سکتا تھا نہ بے اجازت بیٹھ سکتا تھا۔ کم و بیش ایک گھنٹے کی سزا کے بعد اُسی آفتِ جاں کو میری بے کسی پر رحم آیا۔ پرنس سے کہا "یہ بیٹھتے کیوں نہیں؟ اس سوال پر پرنس چونک سے پڑے، فرمایا تم بیٹھتے کیوں نہیں؟ میں نے اس رحمت خسروانہ پر پھر سات سلام کیے، اور بیٹھتا تو کیا، یوں سمجھئے کہ ایک کرسی پر گر پڑا۔

پرنس نے اب اس کا تعارف شروع کیا۔ فرمایا ان کا نام نجمہ ہے۔ میں نے عرض کیا نجم صاحب کی خفگی کا ڈر ہے ورنہ عرض کرتا بہت پیارا نام ہے۔ پرنس خوش دلی سے ہنسنے لگے۔ میں اس عرصے میں اس غیرتِ قمر کے سراپا کا جائزہ لیتا رہا۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کس عضوِ بدن کی توصیف میں شعر پڑھوں، کس پر مسلسل غزل لکھوں۔ بالآخر دل ہی دل میں یہ شعر پڑھنے اور اس کا لطف لینے لگا:

زفرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

پرنس نے بمبئی کے ایک سفر اور وہاں کے حسنِ بے پناہ کی داستان چھیڑ دی۔ میں موقع موقع سے بجا اور درست کہتا رہا۔ ۹ بجے رات کو پرنس کے اے، ڈی، سی حاضر ہو کر آداب بجا لائے۔ اُن کے بعد دو ایک امیر زادے اور چند پیڈ درباری حاضر ہوئے۔ سب کے آخر میں ککو میاں نے حاضر ہو کر سلام کیا۔ آج دس بارہ مصاحبوں سے زیادہ نہ تھے۔ فانی، کیریو، پیا، الک جنگ، ڈھمک جنگ آج کسی کو یاد نہ فرمایا تھا۔ میں نے اے، ڈی، سی سے آہستہ اس کا سبب پوچھا، انہوں نے کہا، یہ بزم خاص ہے، وہ لوگ بزم عام سے متعلق ہیں اس محفل میں ان کا گزر کہاں۔

دس بجے رات کو ایک خوب صورت خادم نے پہلے پرنس کے آگے پھر اس مہ جبیں کے آگے دو شیشہ تپائیاں لگا دیں۔ اس کے بعد مصاحبوں کے آگے اسی طرح کی میزیں رکھیں۔ دوسرے خادم نے پرنس کے آگے بادۂ آتش رنگ کی دو بوتلیں رکھ کر ایک ڈش لا رکھی جس میں بکری کے گردے اور کلیجی کے کباب تھے۔ وہ جگہ کبابوں کی خوشبو سے مہکنے لگی۔ پھر تین بلوریں جام جن کی صفائی دیکھ کر آئینہ بھی شرما جائے بوتلوں کے پاس قرینے سے رکھ دیے۔ آج پہلی مرتبہ میں نے شرابِ انگوری کو بوتل کے اندر سر بہ مہر دیکھا۔ اشارہ پا کر خادم نے ایک بوتل کی کاگ کھولی جو وضع قطع میں عام بوتلوں سے جدا تھی۔ پرنس نے اپنے ہاتھ سے ان بلوریں ساغروں

کو بھرا اور مجھے بے ساختہ اُستاد جلیل کا یہ شعر یاد آیا۔

ساقی! تری شراب جو شیشے میں تھی پری
ساغر میں آ کے اور بھی سانچے میں ڈھل گئی

ایک ساغر پرنس نے اپنے سامنے رکھا' اور دوسرا اُس ناز آفریں کو عطا فرمایا۔ تیسرے کے لئے اُسے اشارہ کیا کہ مجھے اپنے ہاتھ سے دے دوسری بوتل کی شراب خادم اشارہ پاکر دوسرے مصاحبوں کو دینے لگا۔ جس کے آگے پیالہ جاتا وہ اُٹھ کر سات سلام کرتا اور پیالہ خادم سے لے لیتا۔ وہ آفتِ جاں پرنس کے اشارے پر ساغرِ بلوریں ہاتھ میں لے کر اُٹھی اور میرے داہنے ہاتھ کی طرف آکر کھڑی ہو گئی۔ میں گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا اور پرنس سے ہاتھ جوڑ کر عرض کی' "سرکار! مجھے اس سے معاف فرمائیں۔ پیتا تو کجا' میں نے تو آج سے پہلے اس کی شکل بھی نہ دیکھی تھی۔" مگر پرنس اس روز غالباً دل میں طے کر چکے تھے کہ آج صدق کو بے پلائے نہ رہوں گا۔ فرمانے لگے "افسوس! تم یہ نہیں دیکھتے کہ تمہارے لئے زحمت کون کر رہا ہے۔ ایسے موقعے تو قسمت والوں ہی کے ہاتھ آتے ہیں۔ عمر بھر آج کا دن یاد کر کے فخر کرو گے کہ پہلے پہل مجھے کس کے ہاتھ سے شراب ملی تھی۔"

میں نہایت لجاجت سے عذر پہ عذر کرتا رہا' مگر پرنس نے کوئی عذر نہ سُنا۔ وہ یہی فرماتے رہے کہ اگر اب تم ان کے ہاتھ سے شراب پینے میں عذر کیا تو میں آج سے تمہاری شاعری کا قائل نہ رہوں گا۔ غضب خدا کا غزل گو شاعر اور ایسے ماہ وش ساقی کی بات ٹھکرا دے۔ میں کیونکر تم کو شاعر سمجھوں۔ مختصر یہ کہ

اس ردوبدل میں دس منٹ تو ضرور صرف ہوئے ہوں گے۔ جب یہاں تک نوبت پہنچ گئی کہ اگر اب تم نے انکار کیا تو مجھے خود اٹھنا پڑے گا۔ میں سمجھ گیا کہ اب مفر کی کوئی صورت نہیں، فرار کے سب راستے بند ہیں ورنہ ستانی بہ ستم می رسند، والا معاملہ ہے۔ میں نے بہ مجبوری اس دل رُبا کے نازک ہاتھوں سے جام لے لیا۔ استادہ ہو کر پرنس کو دوبارہ سلام کیا۔ پرنس خوش ہو گئے، فرمایا، یہ عقل کی بات ہے۔ میں نے یا غفور کہہ کر پہلا گھونٹ پیا۔ معلوم ہوا دھوکے میں نیم کا پانی پی گیا۔ تلخی کی ایک تیز رو حلق سے سینے تک اترتی ہوئی محسوس ہوئی۔ منہ بنانا مقتضائے فطرت تھا۔ پرنس ہنسنے لگے۔ فرمایا، میں نے تم کو نہایت ہلکی شراب دی ہے اسے شیمپین کہتے ہیں اور لیڈیز ڈرنک کہلاتی ہے۔ دوسرے مصاحبوں کی طرف اشارہ فرمایا، یہ لوگ اِکث نمبر وَن یعنی برانڈی پی رہے ہیں۔ یہ تیز ہوتی ہے۔ چونکہ تم عادی نہ تھے، میں نے شیمپین سے ابتدا کی۔ نقل راچہ عقل، میں بھی دوسروں کی دیکھا دیکھی، انھیں کی طرح ایک ایک گھونٹ پینے لگا۔ اس جگہ ایک قابلِ ذکر بات رہی جاتی ہے کہ ادائلِ عمر میں قاضی میر محمد[1] صاحب نے میرا زائچہ بنایا تھا، جس میں منجملہ اور پیش قیاسیوں کے ایک پیشین گوئی یہ بھی تھی کہ ایک دن شراب بھی پیو گے۔ میں نے اس وقت برا مانا تھا۔ مگر

---

[1] قاضی میر محمد صاحب میر تخلص، ضلع پرتاب گڑھ کے مضافات کے متوطن اس وقت جائس انگریزی مڈل اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ انگریزی کے علاوہ عربی و فارسی میں بھی خاصی دست گاہ رکھتے تھے۔ فرصت کے اوقات میں تعویذ لکھتے،

مگر قاضی صاحب نے یہ کہہ کر معذرت کی تھی کہ میں تو وہ بات کہتا ہوں جو تمہارے ستاروں کی رفتار کہتی ہے۔ اپنی طرف سے ایک حرف بڑھاؤں تو کافر۔ بات گئی گزری ہوئی۔ لیکن مدت کے بعد وہ پیشین گوئی اس طرح پوری ہوئی۔

کچھ دیر کے بعد میں نے نشے کی کیفیت کو بھی محسوس کیا۔ اس میں شک نہیں کہ عارضی مسرت ضرور ہوئی۔ خدا خدا کر کے بارہ بجے دورِ جام ختم ہوا۔ لیکن اس عرصے میں کومیاں براندی کے دس لب ریز گلاس ختم کر چکے تھے۔ دونوں آنکھیں ان کی سرخ تھیں، آواز میں ایک طرح کی بھرّاہٹ پائی جاتی تھی۔ لیکن اب بھی ہاتھ جوڑ کر پرنس کی بات کا جواب دیتے تھے۔ اس بدمستی کے عالم میں بھی اتنا احساس تھا کہ میں کہاں بیٹھا ہوں۔ ان کے علاوہ دوسرے جلیسوں نے بھی پانچ پانچ چھ چھ ساغر لنڈھائے تھے، مگر کیا مجال جو کوئی بہکا ہو۔ سب کے سب آدابِ دربار کے اسی طرح پابند تھے، جیسا میں ہوش و حواس کے عالم میں اُن کو دیکھنے کا عادی تھا۔ اس سے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ جو لوگ شراب پی کر بدمستی کرتے ہیں، اُس بہکنے میں بڑا دخل تصنّع اور

بقیہ حاشیہ ص ۱۰۱ کا۔ لنظر بد اتارتے، ستار بجاتے، شطرنج کھیلتے۔ نجوم میں بھی کافی مہارت تھی۔ شعر بھی کہتے تھے اور بے حد زود گو تھے۔ اب مدت سے تصوف کی طرف زیادہ رجحان ہے۔ ستاسی سال کی عمر ہے۔ جوش کی شاعری کے قائل نہیں۔ ان کو لکڑ توڑ شاعر اور ان کے جواہر پاروں کو ہذیان، بکواس اور نہ جانے کیا کیا کہتے ہیں۔ کم و بیش چالیس سال سے لکھنؤ میں شاہ عبدالرحمٰن صاحب کی درگاہ میں قیام ہے۔

بناوٹ کو ہوتا ہے۔

اب پرنس کے اشارے پر معز اور بندو نے ساز سنبھالا اور سرکاری مشاعرہ شروع ہوا۔ میں رات کے آٹھ بجے کھانے کا عادی' بارہ جو بج گئے تو بھوک سے میرا برا حال تھا۔ اُدھر پرنس نے مجھے یہ کہہ کر مخاطب فرمایا ، صدق! آج تم اکیلے ہو' لیکن ایک ایک شعر پر تڑپ اٹھو تو سند ہے۔"

سرکار کو کیا خبر کہ آج صدق بے شعر سنے ہی بھوک سے تڑپ رہا ہے۔ مگر بندگی بے چارگی۔ میں نے بھوک کا خیال چھوڑ کر شعر ہی پر تڑپنے میں مصلحت دیکھی۔ مصیبت یہ تھی کہ فانی بھی نہ تھے۔ وہ ہوتے تو کچھ وہ کہتے کچھ میں کہتا۔ آج تو مجھی کو پوری محفل کا پارٹ ادا کرنا ہے ——

خدا خدا کر کے دو بجے مشاعرہ ختم ہوا۔ پرنس نے اے' ڈی' سی سے فرمایا' "آج صدق بہت تڑپے ہیں" دیکھو خاصہ تیار ہے ؟" خدام نے عرض کی تیار ہے۔ پرنس اٹھ کھڑے ہوئے۔ مجھے حکم ہوا' تم منہ دھو ڈالو۔ دو منٹ میں ہاتھ منہ دھو کر میں ڈائیننگ روم میں داخل ہوا' اور سب پہلے ہی سے حاضر تھے۔

پرنس کے داہنے ہاتھ کی پہلی کرسی پر وہ حسینہ جلوہ گر تھی۔ بائیں ہاتھ کی طرف پہلی کرسی پر مجھے بیٹھنے کا حکم ہوا۔ میں درباری آداب کر کے اپنی جگہ بیٹھا۔ اس وقت رات کے تین بجے تھے۔ گمان ہوا کہ سحری کھانے بیٹھا ہوں۔ یا تو بھوک سے بے چین تھا' یا اب مطلق اشتہا نہ تھی۔ کھانے کا وقت جو ٹل گیا تو بھوک بھی مر گئی تھی۔ خاصے پر پرنس نے فرمایا' "صدق! مہمانِ عزیز کی خاطر آج خاصے میں تم کو قدرے تکلف نظر آتا ہوگا۔ اسی مجبوری سے خاصے میں اتنی دیر بھی ہوئی۔

لیکن میں یہ کیوں کر گوارا کرتا کہ حسبِ معمول گھر میں جو دال دلیا تیار ہو، وہ ان کے سامنے رکھا جائے۔ مہمان کی تواضع کے احکام ہر مذہب میں موجود ہیں۔" میں نے عرض کیا "خصوصیت کے ساتھ مہمانِ حسین کے لئے۔" پرنس نے خوش دلی سے میرے جملے کو دُھرایا، پھر فرمایا "مثلاً؟" میں نے عرض کیا:

مہمانِ حسیں قابلِ عزّت ہے جدھر جائے
آنکھوں میں ٹھہر جائے کہ سینے میں اُتر جائے

پرنس نے فرمایا "مصرعِ ثانی نے شعر کو بہت بلند کر دیا ہے، خوب ہے، پھر پڑھو۔" میں نے دوبارہ پڑھا۔ پھر فرمانے لگے "تم نے یہ بھی محسوس کیا کہ ان کی وجہ سے آج وقت ہی نہیں معلوم ہوا۔ کوئی دم میں صبح ہوا چاہتی ہے مگر مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابھی ابھی آیا ہوں۔" میں نے دست بستہ عرض کیا:

زلفوں پہ کبھی پھول سے چہرے پہ نظر جائے
کیا وقت ہے وہ بھی جو حضوری میں گزر جائے

پرنس نے بے ساختہ "ڈیری بیوٹی فل" کہا۔ پھر فرمایا "حضوری" کی جتنی داد دی جائے کم ہے۔ جہاں تک میرا مطالعہ ہے اردو کے کسی شاعر نے اس لفظ سے وہ فائدہ نہیں اٹھایا جو تم نے اٹھایا ہے۔" نجمہ نے ایک خوشگوار تبسم کے ساتھ کہا "بہت اچھا کہتے ہیں۔" پرنس فرمانے لگے، "صدق اللہ یہ تمہاری شاعری کی معراج ہے۔ مہاراجا کشن پرشاد یا سر اکبریا ازیں قبیل کوئی بڑے سے بڑا آدمی تمہارے حق میں سو تعریفی جملے کہتا تو میری رائے میں تم کو وہ روحانی مسرت ہرگز نہ حاصل

ہوتی جو اِن کے اس جملے سے ملی ہوگی"۔ میں نے اٹھ کر پہلے پرنس کو اور پھر اس آفتِ جاں کو سلام کیا۔ اس نے ایک عجب اندازِ دل بری سے سر کے اشارے سے سلام لیا۔ اس کے بعد وہ صحبت ختم ہوگئی۔ مجھے گھر جانے کی اجازت ملی۔ دوسرے دن میں نے قاضی میر محمد صاحب کو خط لکھا کہ آفریں ہے آپ کی پیشین گوئی پر۔ شب گزشتہ مجھے اس طرح مجبور ہو کر شراب پینی پڑی۔ قاضی صاحب نے جو جواب لکھا، اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ مارے خوشی کے جامے میں پھولے نہیں سماتے اور میرے خط کو معاذ اللہ اپنی غیب دانی کے لئے ایک طرح کی سند سمجھتے ہیں۔

اس یادگار رات کے بعد پھر پرنس نے عام نائے ونوشش کی محفلوں میں کبھی مجھ سے پینے کو نہ کہا۔ خاص خاص محفلوں میں میں بے شک اُن کا شریک ہوتا تھا، لیکن ایسی محفلیں سال میں نہیں دو ہی چار مرتبہ ہوتی تھیں۔

دوسرے دن سہ پہر کو میں فانی کے گھر گیا۔ ان کو شب گزشتہ کی تمام و کمال روداد سنائی۔ فانی بھی اپنی پیش قیاسی کے حرف بہ حرف صحیح اترنے پر بہت خوش نظر آتے تھے کہنے لگے "مجھے اس بات کا مدتوں سے دھڑکا لگا ہوا تھا۔ تم نے اچھا کیا کہ پرنس کی بات کو نہیں ٹالا۔ میرا خیال ہے کہ آئندہ وہ تم کو مجبور بھی نہ کریں گے۔ ان کا مطلب تو صرف یہ تھا کہ بزمِ رنگین میں کوئی زاہد خشک نہ رہے۔"

جب میں نے اپنے ایک گھنٹے تک کھڑے رہنے اور تین بجے رات تک بھوک سے تڑپنے کا ذکر کیا تو بہت ہنسے، کہنے لگے بھوک کی

مصیبت تو ایک معمولی مصیبت تھی۔ میں نے تو اس سے کہیں زیادہ سختیاں جھیلی ہیں۔ شکر ہے کہ تم اس وقت دربار میں نہ تھے ورنہ دوسرے ہی دن بھاگ کھڑے ہوتے۔

میں نے ہمہ تن شوق بن کر ان کی داستانِ مصیبت سننے پر آمادگی ظاہر کی۔ فانی کہنے لگے کہ برسات کا موسم اور ساون کا مہینہ تھا، آسمان پر ابر دھواں دھار چھایا ہوا تھا، بجلی اس زور و شور سے چمک رہی تھی کہ میں اپنی جگہ بیٹھا اَلحَفِیظ کا ورد کر رہا تھا۔ خاصے کا وقت آیا تو پرنس نے اسٹاف افسر کو حکم دیا کہ خاصے کی میز اس وقت لان پر بچھواؤ، پھر پیا کی طرف دیکھ کر فرمایا "موسم خوشگوار ہے باغ میں کھانے کا لطف آئے گا۔" پیا نے ہاتھ جوڑ کر کہا "بہت صحیح ارشاد ہوا" پھر کہنے لگے "صاحب ماشاء اللہ آپ نے بالکل اپنے دادا کا مزاج پایا ہے۔ اعلیٰ حضرت مرحوم بھی برسات میں اکثر لان ہی پر خاصہ تناول فرماتے تھے۔" پھر دست بستہ ہو کر شعر پڑھا:

کیا موسمِ گل ہے روح فزا، چلتی ہے عجب پرکیف ہوا
وہ چشمِ چمن میں خار بنا، جو چاک گریباں ہو نہ سکا

پرنس نے کہا "پیا سچ کہتے ہو، موسم ایسا ہی فرحت بخش اور فرح ناک ہے۔" دو منٹ کے بعد پرنس اٹھ کھڑے ہوئے، پیچھے پیچھے اس وقت چالیس پینتالیس مصاحب ہوں گے۔ میں نے باہر نکل کر آسمان کا رنگ دیکھا تو کانپ گیا، ایسی گھنگھور گھٹا چھائی ہوئی تھی گویا آج ساری دنیا کو ڈبونے کا تہیہ کر کے اٹھی ہے۔ وہ گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ صرف پرنس کا راستہ برقی قمقموں کی قطار

سے دن کی طرح روشن تھا۔ بجلی کا انجینیر جس کی ڈیوٹی تھی، حکم کے ساتھ ہی باغ پہنچ چکا تھا۔ باغ بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ ہر درخت میں سرخ، سبز، زرد، گلابی، سفید اور اودے رنگ برنگ کے پچاسوں بلب روشن تھے، جن کی نور افشانی سے پورا باغ جگ مگ جگ مگ کر رہا تھا۔ پرنس خراماں خراماں لان پر پہنچے۔ خاصے کی میز اس عالم نور میں آئینے کی طرح چمک رہی تھی۔ پرنس کے بیٹھتے ہی مصاحب سلیقے سے اپنی مقررہ نشستوں پر بیٹھ گئے۔ خدام کی خوب صورت اور نظر فریب ٹکڑی سفید وردیوں میں ملبوس پانی پلانے کے لئے سامنے کھڑی تھی۔ ایک طرف باورچی خانے کا عملہ تھا۔ اسٹاف افسر حکیم کا منتظر بُت بنا ہوا کچھ فاصلے پر کھڑا تھا۔ سروس شروع ہوئی۔ پانی جیسے سروس کا انتظار ہی کر رہا تھا۔ پرنس نے پستئی رنگ کے سوپ سے ادھر پانی نے پھوار سے ابتدا کی ادھر ہی چارمنٹ میں ہماری رکابیوں میں تین حصے سوپ تو ایک حصہ پانی بھر گیا۔ پرنس نے غالباً سوپ کی بدمزگی محسوس کر کے چمچہ ہاتھ سے رکھ دیا۔ پیا سے مخاطب ہوئے "پیا! سوپ اس وقت مزا دے رہا ہے"۔ پیا نے ہاتھ جوڑ کر کہا "بہت صحیح ارشاد ہوا۔ اس وقت یخنی غلام کو بھی روز سے زیادہ لذیذ معلوم ہو رہی ہے"۔ یخنی کی پلیٹوں کا اٹھانا تھا کہ موسلا دھار مینہ برسنے لگا۔ حسنِ اتفاق سے اس روز پرنسز بھی شریکِ طعام تھیں۔ ان سے تو پرنس نے اتنا ضرور کہا کہ آپ اپنے لئے کمرے ہی میں خاصہ منگوا لیجیے وہ اٹھ کر فوراً محل میں چلی گئیں ۔ مجھے یقین تھا کہ اب خود بدولت بھی کھڑے ہوں گے ۔ مگر توبہ کیجیے جو اس اللہ کے بندے کے

کان پر جوں بھی رینگتی ہو۔ بارش ہر لمحہ تیز سے تیز تر ہوتی جاتی تھی اور تم یقین کرنا کہ پروس اسی ادب اور قاعدے سے جاری تھے۔ دو ہی پلیٹوں کے آنے اور اٹھنے میں پرنس اور رود باری شرابور ہو چکے تھے۔ تم ہوتے تو کم از کم اس دن ڈھمک جنگ کی وضع داری کا لوہا مان جاتے میز کے پاس کچھ ایسے آن بان سے بیٹھے تھے گویا کیمرے کے سامنے تصویر کھنچوانے بیٹھے ہوں۔ میں معترض تنخن ہو کر کہا "آپ تو در پردہ اُٹھئیں چلکن کھڑا کیے رہے ہیں۔" نانی بے ساختہ ہنس پڑے کہا تم اپنی شاعری سے کسی وقت نہیں چوکتے، آگے سنو۔ میں کھانا کیا کھا رہا تھا۔ شاہزادے کے دستر خوان کی بریانی جسے تم روز مزے لے لے کھاتے ہو۔ اس دن میرے سامنے آئی تو اس ڈر سے میں نے ایک ہی چمچہ لیا کہ اس طوفانِ آب میں اتنا ہی کھانا دشوار ہو جائے گا۔ یہ عجلت میں نے ایک لقمہ منہ میں رکھا۔ دو سکنڈ میں کیا دیکھتا ہوں کہ میری پلیٹ کا ایک ایک چاول پانی کے سہارے مائل بہ فرار ہے۔ لاحول پڑھ کر اس سے بھی دست کش ہو گیا۔ میں نے ہنس کر کہا "ایں چمچۂ بریانی فانی تہِ آب اولیٰ" اس برجستہ تصرف پر نانی لوٹ پوٹ ہو گئے۔ جب جی بھر کے ہنس چکے تو بولے 'خدا را اس مصرعے سے میرا نام تو نکالو۔ میں نے کہا 'اسے رہنے دیجیے۔ اگر کسی وقت یہ داستان میں قلم بند کر سکا تو پڑھنے والوں کو بڑا لطف آئے گا۔ کیا ایسا ارادہ ہے؟ میں نے کہا' لکھنے کی چیز اور مزے کی بات ہے۔ وقت ملا تو انشاء اللہ ضرور لکھوں گا۔ بولے آگے سنو۔ سالن آنے شروع ہوئے۔ جو سالن لیتا ہوں پلیٹ

تک آتے آتے لوٹیاں اس طرح ڈھل جاتی تھیں گویا آج انھوں نے مسالے کا منہ ہی نہیں دیکھا البتہ پہلی لوٹی میں جسے میں فوراً ہی منہ میں رکھ لیتا تھا کسی قدر نمک اور مرچ کی آمیزش باقی رہ جاتی تھی۔ اُسی کو صبر و شکر کی ساتھ چبا کر نگل جاتا تھا۔ بقیہ دُھل دُھلا کر کھانے کے قابل نہ رہ جاتی تھیں۔ غنیمت یہ ہوا کہ سالن آٹھ دس قسم کے تھے۔ میں نے ہر سالن کی ایک ایک لوٹی سے پیٹ کے دوزخ کو بھر لیا۔

پرنس ایسی ادائے بے نیازی سے صدر میں رونق افروز تھے گویا سینما ہال میں کوئی پکچر ملاحظہ فرمارہے ہیں۔ ادھر پانی کے زبانِ حال سے کہہ رہے تھے آج ساتوں سمندر کا پانی اُلیچ کے تم سب پر نہ پھینک دیا تو ہمیں ساون کی گھٹا نہ کہنا۔ غضب خدا کا تمہارے شورِ تحسین سے پڑوسیوں کی نیند حرام ہو گئی۔ غریب رحمت علی[1] ساری رات ٹہل ٹہل کر گزارتا ہے۔ چوتھے آسمان پر حضرت عیسیٰ کی نمازِ شب میں خلل پڑتا ہے۔ اے بدانجامو! رات اللہ نے سونے کے لئے بنائی ہے یا تمہاری اس یاوہ گوئی کے لئے جس میں تم سحر تک مبتلا رہتے ہو۔

پانی کا زور دم بہ دم بڑھتا ہی جاتا تھا طوفانِ نوح کا سماں پیش نظر تھا۔ وہاں بڑھیا کے روشن تنور سے پانی کا دھارا نکلا تھا یہاں بار بار میں سہمگیں نظروں سے اپنی پلیٹ کو تکتا تھا کہ کب اس سے چادرِ آب اٹھتی ہے اور کب ہم سب کے سب دریا برد

---

[1] رحمت علی ایک انجنیئر، ہل فورٹ کے نیچے رہا کرتے تھے۔

ہوتے ہیں۔ افسوس کہ وقتِ آخر کفن سے بھی محروم رہے۔ قسمت کی دو چپاتیاں حسبِ معمول آج بھی میرے آگے رکھی تھیں۔ مگر انھیں چھونے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ یہ مصرع میرے حسبِ حال تھا:

ع ”ہاتھ آئیں تو انھیں ہاتھ لگائے نہ بنے“

اس تصرفِ معنوی کی میں نے بہت تعریف کی۔ فانی نے خوش ہو کر کہا خدا اکرکے لوزا اور بالائی کی ڈش میرے پاس آئی۔ میں نے پیشتر بالائی نکالی لیکن لوزا اٹھاتے اٹھاتے وہ پھٹے ہوئے دودھ کی شکل میں تبدیل ہو چکی تھی۔ گھبرا کر بادامی اور پستئی لوزوں پر نگاہ ڈالی۔ وہ مٹھائی کی دورنگی گولیوں کی صورت میں ابھی تک ہاتھ میں تھے جھلا کر انھیں گولیوں کو منہ میں رکھ لیا کہ منہ کا ذائقہ کچھ تو ضرور ہی تبدیل ہو جائے گا۔ تاخیر کرنے میں یہ بھی ڈر تھا کہ کچھ دیر میں یہ گولیاں کوئی نیا روپ نہ بھر لیں اور پھر کام ہی کی نہ رہ جائیں۔ مبالغہ نہ سمجھنا ہمارے سروں پر اتنا پانی پڑ چکا تھا کہ ڈنر کے اختتام پر پانی کی ایک موٹی دھار شیروانی، قمیص اور بنیان کو توڑ کر میری پیٹھ پر مسلسل بہہ رہی تھی۔ طرفہ یہ کہ اس کم بخت دھار کا رخ جانبِ نشیب تھا جس سے سارا پاجامہ نخدہ لت پت ہو گیا تھا۔

ڈنر کے خاتمے پر پرنس نے اطمینان سے ہاتھ دھوئے، طمانیت کے ساتھ گلوری کھائی، پھر بڑی دل جمعی سے خلال کرنے لگے۔ خدمت گاروں نے اب مصاحبوں کے ہاتھ دھلوانے شروع کر دیئے، حالانکہ اس دن یہ ایک غیر ضروری سی بات تھی۔ ہمارے ہاتھ پہلے ہی سے دُھلے دُھلائے تھے۔

پرنس پیا سے رابعہ بصری کے سفرِ حج پر گفتگو فرما رہے تھے۔ مجھے اس بے کسی میں تصور بندھا کہ میں غالباً کوئی وحشت ناک خواب دیکھ رہا ہوں۔ آنکھ کھلے گی تو گرم بستر گرم کمبل ہوگا۔ مگر پانی کے تھپیڑے منہ بگاڑے دیتے ہیں۔ پانی آنکھوں میں گھسا جاتا تھا۔ ایسی بیداری کو خواب کیونکر تسلیم کرتا۔ پندرہ منٹ کے بعد پرنس کرسی سے اٹھے۔ ہم سب بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ آگے آگے پرنس پیچھے مصاحبوں کا تربتر انبوہ۔ سرکار اُس وقت بھی اُس اطمینان سے چل رہے تھے گویا اچھے بھلے دن میں گل گشتِ چمن میں مصروف ہیں۔ چلتے چلتے یکایک ڈیڑے پیا سے فرمایا "حضرت رابعہ بصری اپنے وقت کی قطب تھیں۔" پیا نے دست بستہ عرض کیا "بہت صحیح ارشاد ہوا۔ صاحب خانہ زاد نے بزرگوں سے سنا ہے کہ ان کی خدمت میں بڑے بڑے اولیاء اللہ حاضر ہوا کرتے تھے۔" غرض اسی طرح ٹھہرتے اور چلتے خدا خدا کر کے ہل فورٹ کی گیلری میں داخل ہوئے چھت کا سایہ ہمارے سروں کو اور کسی قدر گرمی ہمارے جسموں کو نصیب ہوئی۔

اِسی حالت میں ہمیں چھوڑ کر خود بدولت غسل خانے میں گھس گئے، اور پانچ منٹ کے اندر لباس تبدیل کر کے برآمد ہوئے۔ مجھے اُمید تھی، اب حکم دیں گے، تم لوگ بھی گھر جاکر کپڑے بدل ڈالو اور آرام کرو، یا توشے خانے کے داروغہ کو حکم دیں گے کہ ان کو ایک ایک دُھلا ہوا جوڑا دے دو۔ یہ لوگ بھی بدن پونچھ کے لباس بدل لیں۔ مگر توبہ کیجیے جو ان میں سے ایک بات بھی کی ہو۔ دربار ہال میں اپنی

کرسی پر بیٹھ گئے۔ ہم سب کی باری باری پکار ہوئی۔ ہم سب اپنی اپنی جگہ بیٹھے، بُعز اور بند وچوکی پر گئے اور مشاعرہ شروع گیا۔

میں نے کہا آپ کبھی جھوٹ نہیں بولتے، نہ مبالغہ کرنے کی عادت ہے، اِس لئے میں اِسے صحیح سمجھنے پر مجبور ہوں۔ دوسرا کہتا تو کبھی یقین نہ کرتا۔ فانی کہنے لگے یہ سب اسی طرح صحیح ہے جیسے اس وقت شام کے ۵ بجے ہیں۔ اور تم یقین کرنا کہ تین بجے رات تک وہ بھیگے کپڑے ہمارے جسموں ہی پر خشک ہو گئے۔ جب کہیں ہمیں گھر جانے کی اجازت ملی۔ اب انصاف سے کہو تمہاری چند گھنٹوں کی بھوک اور صرف ایک گھنٹے کھڑے رہنے کی زحمت زیادہ تھی یا میری مصیبت؟ میں نے تسلیم کیا' آپ کی مصیبت میری زحمت سے زیادہ تھی۔ میں نے کہا' مجھے افسوس ہے کہ میں اس ڈنر میں شریک نہ تھا' ورنہ جس وقت پرنس نے محل کا رُخ کیا تھا' دست بستہ عرض کرتا' سرکار! موسم نہایت خوش گوار ہے' مضائقہ نہ ہو تو آج مشاعرہ بھی لان ہی پر منعقد ہو۔ فانی بے اختیار ہنسنے لگے۔ پھر بولے' بے شک کہنے کی بات تھی' مگر تم ہی کہہ بھی سکتے تھے۔

جھمن کی بے تمیزی

فانی کی رام کہانی خود ان کی زبانی سُن کر حیران و ششدر میں گھر پلٹا تو شام ہو چکی تھی۔ آج پہلا کام میں نے یہ کیا کہ کچھ کھا کر بارہ ایک بجے رات تک دربار میں باطمینان بیٹھنے کا بندوبست کر لیا۔

منہ ہاتھ دھوکر کنگھا کیا کپڑے تبدیل کئے۔ آٹھ بجے موٹر آگئی۔ آج بھی ثانی نہ تھے۔ میں تنہا ہی اس طلسمی مکان کی طرف سدھارا جو ریڈ ہل پر واقع تھا۔ موٹر سے اُترتے ہی اسی خوبصورت خادم نے مُسکرا کر میرا استقبال کیا اور اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے خود آگے آگے ہو لیا۔ مختلف گیلریوں اور آراستہ کمروں کو طے کرنے کے بعد ایک نئے کمرے کے سامنے رک کر مجھے ٹھہرنے کا اشارہ کیا، خود اندر جا کر میری حاضری کی اطلاع کی، ایک منٹ کے اندر باہر آکر مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا، میں نے مجر بہادر مر سہا کہہ کر کمرے میں قدم رکھا۔

پرنس آج آئینہ خانے میں تشریف فرما تھے۔ پہلو میں دوسری کرسی پر وہی حسینہ جلوہ افروز تھی۔ اس کمرے کا فرش، فرنیچر، پردے سب نہایت بیش قیمت تھے۔ دیواروں پر ہلکے گلابی رنگ کی قلعی تھی، چھت میں طرح طرح کے نقش و نگار تھے۔ جس دروازے سے میں داخل ہوا تھا، اس کے علاوہ کوئی دروازہ نہ تھا۔ دیواریں ہر طرف بیش قیمت آئینے جڑے ہوئے تھے جو طول میں کسی طرح سات سات فٹ سے کم نہ ہوں گے۔

پرنس کا سامنا ہوتے ہی میں نے درباری سلام کیا۔ انھوں نے ایک خوش گوار تبسم کے ساتھ سر کو خفیف سی جنبش دی۔ پھر اس آفتِ جاں کے روبرو، سینے پر دونوں ہاتھ رکھ کر ادب سے سر جھکایا۔ پرنس نے فرمایا "آؤ، بیٹھو۔" پھر ایک بار آداب بجا لاکر میں نے سامنے کی کرسی پر بیٹھنا چاہا۔ حکم ہوا: "وہاں نہیں، اِدھر آؤ، ہمارے پاس بیٹھو۔" میں نے اٹھ کر سات سلام کئے اور دست بستہ

عرض کیا "خانہ زاد آقا کے برابر کیوں کر بیٹھے۔" ارشاد ہوا "ہم حکم جو دے رہے ہیں۔" میں نے پھر سات سلام کئے اور ادب سے پرنس کے برابر والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اتنے میں خادم نے شیام صاحب کی اطلاع دی۔ حکم ہوا "بلالو۔" شیام صاحب آج بڑی سج سے تشریف لائے تھے۔ گھٹی ہوئی ڈاڑھی، مونچھوں پر جاپانی خضاب کی پالش، نئی شیروانی، نئی دستار، کمر میں مانگے تانگے کا نیا بکلوس، پاؤں میں کم قیمت کا لیے پالش پمپ، پاجامے پر چیک سے کے دس بیس دھبے۔ سامنے آتے ہی آداب بجالائے۔ حکم ہوا "ان کے پاس والی کرسی پر بیٹھو" (اشارہ نجمہ کی طرف تھا۔) شیام صاحب اس بے تکلفی سے اس کے برابر ڈٹ گئے گویا بے تکلف دوستوں کی محفل ہو۔ نہ اَدب نہ آداب۔ ارشاد ہوا "کہو لغلول! دوپہر کا خاصہ تم نے ان کو سلیقے سے کھلایا تھا کسی چیز کی کمی تو نہ تھی؟" شیام صاحب نے دست بستہ عرض کیا "سرکار کے اقبال سے کسی شئے کی کمی نہ تھی۔ غلام موٹر پر اتنا خاصہ لدوا لایا تھا جو دس آدمیوں کے لئے کافی ہوتا۔ یہ بے چاری تو تنہا کھانے والی تھیں اور شریک صرف یہ غلام تھا۔"

پرنس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ فرمایا "صدق! ہم نے شیام کو لغلول کا خطاب دیا ہے۔ تمہاری رائے میں کیسا خطاب ہے؟" میں نے دست بستہ عرض کیا "نہایت موزوں اور بہت زیبا۔" وہ گل فام کھِل کھِلا کر ہنسی۔ شیام صاحب نے مجھے بہ نگاہِ قہر گھورا۔

پرنس فرمانے لگے "آج جدھر آنکھ اٹھا کر دیکھو انھیں کا جلوہ ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ تم انھیں کی طرف دیکھو۔ جدھر چاہے دیکھو، دکھائی یہی دیں گی۔" میں نے دست بستہ شعر پڑھا:

جڑے ہیں ہر طرف خلوت کدے میں ان کے آئینے
تنِ تنہا چلا کرتی ہیں چوٹیں ہر مقابل سے

پرنس بے حد محظوظ ہوئے۔ اس رشک ماہ نے بھی پسندیدگی کا اظہار کیا۔
تھوڑی دیر کے بعد کیریو (قاری سلیمان سیٹھ) تشریف لائے
پرنس نے بڑی شگفتگی سے فرمایا "آؤ کیریو۔ کل میں عجلت میں تمہیں
بلانا ہی بھول گیا تھا۔ تم آجاتے ہو تو محفل میں جان سی آجاتی ہے۔ کیریو
سرفرازی، بندہ نوازی کہتے ہوئے میرے پاس بیٹھ گئے۔ ان کے بعد
اے، ڈی، سی اور وہی درباری جو کل کی صحبت میں شریک تھے،
حاضر ہوئے۔

آج مہمانِ عزیز کی دل چسپی کے لیے لکھنؤ کا آیا ہوا ایک طائفہ
بلوایا گیا تھا۔ کچھ دیر میں صحن مکان سے ساز کی آواز آنے لگی اور پرنس
اٹھ کر صحن میں تشریف لے گئے۔ ناچ شروع ہوا اور رقاصہ فنِ رقص
کے کمالات دکھانے لگی۔ اتفاق سے ایک چکر میں کیریو کی سپید اور مقدس
ڈاڑھی کا مغنیہ کی ساڑی کے آنچل نے بھری محفل میں بوسہ لے لیا۔ کیریو
اس بد اتفاقی پر چیں بہ جبیں ہوئے۔ پرنس بے اختیار ہنسنے لگے۔ مجھ
سے ارشاد ہوا "صدق! یہ ہمارے استاد ہیں۔ میں ان کا نہایت
ادب کرتا ہوں۔ اسی لیے جب کوئی حسینہ میری محفل میں آجاتی ہے
تو میں تبرکاً اور تیمناً ان کی ڈاڑھی سے اس کی ساڑی کے دامن کو مس
کرا لیتا ہوں تاکہ اس کے گناہ نامۂ اعمال سے محو کر دیئے جائیں۔" کیریو
نے نہایت برہمی سے کہا "بجا ارشاد ہوا۔" اس اظہار خفگی پر سارے
درباری کھِل کھِلا کر ہنسنے لگے۔ وہ غیرتِ ماہ بھی بہت ہنسی۔ غرض

انھیں رنگ رلیوں میں ایک بج گیا۔ پرنس کے اشارے پر ناچ موقوف ہوا۔ حکم ہوا میز پر خاصہ لگاؤ۔

مجھے حکم ملا کہ ہاتھ منہ دھو ڈالو۔ میں ہاتھ منہ دھو کر ڈائننگ ہال میں داخل ہوا۔ پرنس کے داہنے ہاتھ پر نجمہ کی نشست تھی۔ بائیں ہاتھ کی پہلی کرسی پر مجھے بیٹھنے کا حکم ہوا۔ میرے بعد اے ڈی سی ان کے بعد دوسرے درباری تھے۔ نجمہ کے بعد شیام صاحب ان کے بعد مصاحبوں کی لائن تھی۔ بے چارے فانی، املک جنگ، ڈھمک جنگ اور دوسرے عام مصاحب آج کی محفل میں بھی باریابی سے محروم رہے۔

آج میز گوناگوں نعمتوں سے لدی ہوئی تھی۔ خصوصیت کے ساتھ بریانی پلاؤ، فن کار باورچی نے ایسا نفیس تیار کیا تھا جس پر گمان ہوتا تھا کہ یہ قاب بہشت بریں سے اتری ہے۔ یہی حال دوسری نعمتوں کا تھا۔ جو شے تھی لاجواب پکی تھی۔

میری نظر اس گل اندام کے روئے روشن پر تھی۔ انگل سے چھری اور کانٹے کی مدد سے کھانا بھی کھاتا جاتا تھا۔ مگر کھانے سے کہیں زیادہ لذت نظارۂ جمال سے حاصل ہوتی تھی۔ دل ہی دل میں قدرت کی صناعی پر اش اش کرتا تھا۔ رہ رہ کے خیال آتا تھا کہ دولت میں کتنی طاقت ہے۔ جس نے ایسے محبوب رنگیں ادا کو بمبئی سے حیدرآباد کھینچ بلایا۔ پرنس کیسے خوش نصیب ہیں۔ جن کی محفل میں ایسی رشکِ حور زینتِ محفل بنے۔ ڈنر کے بعد پرنس اسی میز پر ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ ان محفلوں میں پیا بھی نہ بلائے جاتے تھے۔ ... شریکِ صحبت رہتے تھے وہ سب کے سب

نوجوان اور کم عمر تھے۔ پرنس کسی کی طرف متوجہ نہ تھے۔ جو ارشاد ہوتا تھا وہ مجھی سے۔ اس توجہ سے میری جان عذاب میں تھی۔ ذرا سی لغزش ہو جائے تو لینے کے دینے پڑ جائیں۔ اسی سلسلے میں یہ بھی ارشاد ہوا کہ آج دوپہر کو لکھنؤ کا ایک آدمی میرے پاس راجہ صاحب محمود آباد کا ایک سفارشی خط لے کر آیا تھا۔ میں نے اسے نظامیہ ہوٹل میں ٹھہرا دیا۔ جب ہل فورٹ میں تم کو یاد کروں گا تو تم اُسے دیکھو گے۔ شعر بھی کہتا ہے۔ میں نے تخلص پوچھا، فرمایا تخلص صحیح طور پر میں تمہیں بتا سکتا لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ بھینس کا ہم قافیہ کوئی تخلص اس نے مجھے بتایا تھا۔ اس ارشاد پر وہ مہ جبیں کھل کھلا کر ہنسنے لگی۔ میں نے عرض کیا، کیا عجب ہے کہ بھینس ہی تخلص فرماتے ہوں۔ اس کے اچھوتے ہونے میں تو کوئی کلام ہی نہیں۔" اس پر پرنس بھی بے اختیار ہنسنے لگے۔ فرمایا "نہیں نہیں! بھینس اس کا تخلص نہیں ہے۔ مگر ہے کوئی لفظ اس کا ہم قافیہ، تم خود ہی جو دیکھو گے۔"

اِدھر میں نے بہت خوب کہا اُدھر پرنس نے گھڑی دیکھی۔ فرمایا "ڈھائی بجے ہیں۔ تمہارے جانے کا وقت آ گیا۔ مگر جانے سے پہلے ان کو کوئی ایسا لطیفہ سناتے جاؤ جس پر یہ بے اختیار ہنس دیں۔" میں نے دست بستہ عرض کیا گزشتہ جولائی میں ورنگل انٹر کالج کا سالانہ مشاعرہ تھا۔ سرکار اس وقت اوٹی میں رونق افروز تھے مجھے فرصت تھی۔ اُدھر ورنگل کے احباب کئی برس سے باصرار بلا رہے تھے۔ مجھے موقع نہ ملتا تھا۔ اب کی فرصت کو غنیمت جان کر چلا گیا۔ مشاعرے کی رات کالج کا ہال سامعین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔

کالج کے چند طلبا ہی نے غزلیں پڑھی تھیں کہ کالج کے استاد محمد اسمعیل صاحب ذبیح اپنی جگہ سے اٹھ کر تخت پر اپنی غزل پڑھنے کی نیت سے بیٹھے۔ اہلِ مشاعرہ ہمہ تن گوش تھے کہ دیکھیں کیا پڑھتے ہیں۔ انھوں نے مطلع سنایا ؎

نکلنے کو حسرت وصل کی اے نازنیں نکلی
مگر جیسی نکلنی چاہیئے ویسی نہیں نکلی

ہال کے ایک گوشے سے کسی نے باواز بلند کہا حضور ہماری رائے میں نازنیں اتنی قصوروار نہیں جتنے خود آپ ہیں۔ اس جملے پر سارا ہال قہقہوں سے گونج گیا۔ خود پرنسپل بے اختیار ہنسنے لگے۔ سارا ضبط و نظم درہم برہم ہو گیا۔ حکیم ذبیح صاحب مطلعے کے آگے نہ پڑھ سکے۔ غزل پھاڑ کر پھینک دی، بکتے جھکتے ڈائس سے اتر آئے۔

پرنس مارے خوشی کے خود لوٹے جا رہے تھے۔ اُدھر اُس رشکِ قمر کا ہنسی سے برا حال تھا۔ پرنس اس قدر ہنسے کہ آنسو نکل آئے اور خدام تولیا لے کر دوڑے۔ بارے ہنسی کا دور دورہ ختم ہوا۔ اب تین بج چکے تھے۔ مجھے بھی ہنسی خوشی سرکار نے گھر جانے کی اجازت دے دی اور اس گرما گرم لطیفے کو بہت پسند کیا۔

عیش و نشاط کی یہ محفلیں مسلسل دو ہفتے گرم رہیں۔ انجام کار جس طرح دنیا میں ہر خوشی کی ایک انتہا ہوتی ہے یہ خوشی بھی ایک دن ختم ہو گئی۔ مہمان عزیز رخصت ہو گیا۔ اس شام کو موٹر مجھے لے آئی تو فانی پہلے سے موٹر پر موجود تھے۔ مجھے دیکھ کر ہنسے، اور کہنے

لگے گزشتہ دو ہفتوں میں تم نے جی بھر کے دادِ عیش دے لی۔ آج پھر ہل فورٹ ہے اور ہم ہیں۔ وہی جانی پہچانی صورتیں ہوں گی وہی حالات ہوں گے۔

آج خاصے کی میز پر وہی قدیم نمک خوار تھے۔ مگر میں نے اپنے سامنے کی صف میں ایک اجنبی کو دیکھا۔ معاً خیال آیا ہو نہ ہو یہی وہ آدمی ہے جس کا ذکر اشارۃً "سرکار ریڈ ہل والے مکان میں کر چکے ہیں۔ اسنے میں پرنس نے خود ہی اُس کا ان لفظوں میں تعارف کرا دیا۔ "صدق یہی جو تمہارے سامنے بیٹھے ہیں، لکھنؤ سے راجا محمود آباد کا خط لے کر میرے پاس آئے ہیں۔ بن نام ہے طیش تخلص کرتے ہیں۔ ایک سرکس میں ان کا بھی کچھ حصہ ہے۔ راجا صاحب نے مجھے لکھا ہے کہ میں ان کے سرکس کے لیے ان کو کوئی موزوں جگہ دلوا دوں۔ چنانچہ میں نے کوتوال کو بلا کر اس کو حکم بھی دے دیا ہے۔ پتلی باولی کے سامنے کا میدان میری رائے میں نہایت موزوں جگہ ہے وہی مناسب ہوگا۔" فانی نے دست بستہ عرض کیا "سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ نافِ شہر میں ہے۔" اُمک جنگ ہاتھ باندھ کر بولے، اب تک جتنے اچھے سرکس بلدے میں آئے ہیں وہیں ٹھہرے ہیں۔" ڈھمک جنگ بولے "سرکار نے بہت اچھی جگہ تجویز فرمائی۔ اس سے بہتر جگہ شہر کے وسط میں ملنی محال تھی۔"

پرنس نے ارشاد فرمایا "مجھے راجا صاحب محمود آباد کی سفارش کا بڑا خیال تھا۔" انھیں باتوں میں ڈنر اختتام کو پہنچا۔ بالائی اور لوز کی آخری ڈش جب پرنس کے سامنے آئی تو انھوں نے

ایک پلیٹ منگوا کر کم و بیش اس میں آدھ پاؤ بالائی نکالی پھر اپنے ہاتھ سے دو کوزہ بادام کے اور وہی لپیٹے کے رکھ کر وہ پلیٹ جمّن کی طرف بڑھائی۔ فرمایا "جمّن تم لکھنؤ کے رہنے والے ہو، جہاں کی بالائی مشہور ہے ذرا ہمارے یہاں کی بالائی بھی چکھو۔" اس گنوار نے وہ پلیٹ بغیر ادب و آداب کے لے کر چمچہ بھر بالائی منہ میں ڈالی۔ پھر منڈیا ہلا کر بولا "ہوں، یہ بھی بُری نہیں ہے۔"

پرنس مجھے اور فانی کو دیکھ کر مسکرائے۔ ہم لوگ بھی ہنس دیے۔ مگر مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ راجا صاحب محمود آباد جن کے ادنیٰ خدمت گزار بھی اعلیٰ درجے کے مہذب اور شائستہ ہیں، انھوں نے لکھنؤ ایسے شہر سے جہاں کی تہذیب اور شائستگی ضرب المثل ہے، اتنے بڑے دربار میں بھیجا، تو ایسا جانگلو بھیجا۔ یقین نہ آتا تھا کہ یہ شخص لکھنؤ کا باشندہ ہے، یا راجا صاحب محمود آباد کے دربار سے دور کا بھی تعلق رکھتا ہے، مگر چپ تھا کیونکہ ان کے سفارشی خط کی تصدیق خود پرنس فرما چکے تھے۔

خاصے کے بعد جب دربار جما، تو پرنس نے مہمان نوازی کی راہ سے اُس سے اپنا کلام سنانے کی فرمائش کی۔ دو تین غزلوں سے اس نے ہم سب کی سامعہ خراشی کی۔ کسی کو کوئی لطف نہ آیا۔ غالباً پرنس بھی فرمائش کر کے پچھتائے۔ ارشاد ہوا "اچھا جمّن اب تم جا کر آرام کرو، میں تمھیں پھر یاد کروں گا۔" اُسے رخصت کر کے پیا سے مخاطب ہوئے۔ فرمایا "تم نے اس کا کلام سُنا؟" پیا نے کہا "بالکل بے مزہ کلام ہے۔" پرنس کہنے لگے "میرا منشا یہ ہے کہ فانی اور صدق

کا کلام جس طرح دل سے تعلق رکھتا ہے، اُس کے کلام کو دل سے کوئی تعلق نہیں۔" اٹک جنگ اور ڈھمک جنگ یک زبان ہو کر دست بستہ عرض کیا، "لاحول ولا قوۃ! اٹک بندی کرتا ہے، شاعری سے اُسے کیا سروکار ہے۔"

پرنس فرمانے لگے "میں تو دعوے سے کہتا ہوں اس کی شاعری کو دل سے کوئی لگاؤ نہیں۔" میں جو پہلے ہی سے جلا بھنا بیٹھا تھا، ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا، عرض کیا "فدوی بھی دعوے سے کہتا ہے کہ اُس کی شاعری کو دماغ سے بھی کوئی لگاؤ نہیں۔" فانی سب سے پہلے کھل کھلا کر ہنسے۔ پھر سب درباری ہنس پڑے۔ پرنس بہت ہنسے۔ پھر فرمایا "میرے قول کے موافق اس کی شاعری کو دل سے تعلق نہیں، تمہارے قول کے مطابق دماغ سے لگاؤ نہیں، تو آخر پھر کس مقام سے ہے؟" میں نے عرض کیا "دربار میں اس کی وضاحت کا محل نہیں۔ لیکن یہاں سب اہلِ علم اور اہلِ کمال بیٹھے ہیں، سب کے سب اس اشارے کا پورا لطف اُٹھا چکے۔"

پرنس پیا کی طرف مخاطب ہوئے "پیا دیکھتے ہو صدق کی ذہانت۔ میں نے ایک معمولی سی بات کہی تھی کہ اس کی شاعری کو دل سے کوئی لگاؤ نہیں، آپ جھٹ کھڑے ہو گئے کہ فدوی کی رائے میں دماغ سے بھی کوئی لگاؤ نہیں۔" پیا ہنسنے لگے۔ پھر کہا "صاحب! بادشاہوں اور شاہزادوں کی صحبت میں ایسے ہی ذہین اور طباع رہ بھی سکتے ہیں۔" میں نے اٹھ کر پیا کو سلام کیا۔

پیا نے کہا "صاحب! آپ نے شاید وہ نادر شاہ اور

مرزا مہدی کی حکایت نہیں سُنی۔ نادر شاہ اپنی پہلی یورش میں جب دریائے اٹک کے کنارے پہنچا، مرزا مہدی (سکریڑی) سامنے حاضر تھے۔ اُن سے کہنے لگے، مرزا تم مجھے کوئی ایسی غذا بتا سکتے ہو جو کھانے میں ایک ہی لقمہ ہو مگر دنیا کی ہر غذا سے زیادہ لذیز ہو۔ مرزا مہدی نے دست بستہ عرض کیا، جہاں پناہ! بیضۂ مرغ۔

اس کے بعد ہی نادر شاہ اپنے فوجی کاروبار میں ایسا مصروف ہوا کہ یہ گفتگو وہیں ختم ہو گئی۔ دہلی کو تاراج کر کے برسوں کے بعد جب واپس ہوا اور پھر دریائے اٹک کے کنارے گھوڑا روکا، تو محولۂ بالا گفتگو یاد آ گئی۔ پوچھا "مرزا مہدی کس چیز کے ساتھ؟" مرزا مہدی نے کہا، "خداوندا! سیاہ مرچ اور نمک کے ساتھ"۔ بادشاہ خوش ہو گیا، اور جو لوگ اُس کے قریب تھے، مرزا مہدی کی ذہانت پر آش آش کرنے لگے۔

تمام اہلِ دربار نے اس لطیفہ کو پسند کیا۔ پرنس بھی بہت خوش ہوئے۔ یکایک مجھ سے ارشاد ہوا، "اچھا، صدق تم مجھے کوئی ایسا شعر سناؤ جس کا تعلق محض دماغ سے ہو، دل سے کوئی لگاؤ نہ ہو"۔ میں نے دست بستہ عرض کیا ؎

ساتویں شب اپنے کوٹھے پر وہ مہ پارہ چڑھا
دونوں ٹکڑے مل گئے اک چاند پورا ہو گیا

پرنس اور فآنی بہ یک وقت پھڑک گئے۔ سب درباری بھی تعریف کرنے لگے۔ پرنس نے فآنی کو مخاطب کر کے فرمایا، "فآنی دیکھو! صدق نے کیا شعر سنایا ہے"۔ فانی نے کہا "اس کی ان کے پاس کیا کمی۔ دیوان

کے دیوان حفظ ہیں۔"

پرنس پھر مجھ سے مخاطب ہوئے۔ فرمایا" صدق! کیا تم برجستہ کوئی ایسا شعر مجھے سُنا سکتے ہو جو ہو تو بامعنی مگر میری سمجھ میں نہ آئے بشرطیکہ کوئی ثقیل اور نامانوس لفظ بھی نہ آنے پائے۔" فانی بیچ میں بول اٹھے" کمال تو جب ہے کہ میں کبھی نہ سمجھ سکوں۔" میں نے کہا" انشاء اللہ! ایسا ہی شعر پڑھوں گا۔" اور جھٹ پرنس کی خدمت میں یہ شعر پیش کر دیا ؎

تصویرِ کہنہ پر بھی رہیں بدگمانیاں
خط اُن کے جس کے پاس گئے بے ٹکٹ گئے

شاہزادہ کیوان حشم، فانی اور سارا دربار دریائے فکر میں غوطے لگاتا تھا، مگر گوہرِ مقصود کسی کے ہاتھ نہ آتا تھا۔ میں کچھ دیر کے لئے پورے دربار کو اسی حال میں چھوڑتا ہوں اور ذرا دیر کے لئے ناظرین کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ وہ بھی اپنے اپنے ذہنِ رسا کی آزمائش کر لیں۔

"صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کیلئے"

داغ کی شہسواری

امک جنگ اور ڈھمک جنگ نے بہتیرا زور مارا کہ شعر کا مفہوم پا جائیں، مگر خاک سمجھ میں نہ آیا۔ دریائے فکر کی غواصی ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ جب غوطہ لگا کر اُبھرتے، گوہرِ مقصود کی جگہ کیچڑ ہا

ہاتھ میں ہوتی۔ مجوب ہو کر پھر غوطہ لگاتے اور اب کی پہلے سے زیادہ خفیف اور سبک ہوتے۔

آخر پرنس نے فرمایا "فانی! تمھاری سمجھ میں کچھ آیا؟" فانی نے عرض کیا "سرکار! فدوی تو نہیں سمجھا" پرنس نے مجھ سے دریافت فرمایا "صدق! شعر کس کا ہے؟" میں نے عرض کیا "نیر شکوہ آبادی کا شعر ہے" فانی کہنے لگے "نیر شکوہ آبادی مسلم الثبوت اُستاد تھے۔ اُن کا شعر مہمل تو ہو ہی نہیں سکتا۔ شعر کے بامعنی ہونے میں اب کلام نہیں" ایک جنگ بولے "فدوی نے تو ان کا نام تک نہیں سُنا" دربارِ رام پور سے ان کا تعلق تھا۔ نواب یوسف علی خاں نے جب ان کی وہ غزل کسی کی زبانی سُنی جس کے مقطع میں اُنھوں نے کہا تھا

شرمندہ خود ہوں اپنے کمالوں کے سامنے

تو ازراہِ قدردانی، ان کو یہ شعر لکھ بھیجا تھا

ناظم! نیر آئیے یہاں ہم ہیں قدرداں
شرمندہ کیوں ہے اپنے کمالوں کے سامنے

نواب صاحب کی طرف سے طلبی کا فرمان پاکر نیر رام پور حاضر ہوئے اور پھر تمام عمر اسی دربار سے وابستہ رہے۔

پرنس نے کہا "پیا! اگلے زمانے کے روٗسا اہلِ کمال کی کیسی قدر کرتے تھے" پیا نے کہا "بہت صحیح ارشاد ہوا مگر حیدرآباد کے دربار سے زیادہ اہلِ کمال کی کہیں قدر نہیں ہوئی۔ صاحب! سرکار مرحوم نے جس روز داغ کو ملازم رکھا، ایک ہزار ماہانہ کے

حساب سے دس برس کی تنخواہ ایک مُشت دلوادی۔ نبنڈیوں (چھکڑوں) پر روپیہ لدکر داغ صاحب کے گھر گیا تھا۔ فدوی کی آنکھوں دیکھی بات ہے۔" پرنس نے دریافت فرمایا "کیا داغ کو دس برس سے تنخواہ نہ ملی تھی؟" پیا کہنے لگے "نہیں صاحب! داغ صاحب ملازم ہی کہاں ہوئے تھے کہ تنخواہ کے حق دار ہوتے۔ واقعہ یہ ہے کہ نواب کلب علی خاں مرحوم کے بعد اُن کے جانشینوں میں یہ صلاحیت نہ تھی کہ اَدب کے باغ کی آب یاری کر سکتے۔ اہلِ کمال کا پھر رام پور میں کوئی پرسانِ حال نہ رہا۔ مدتوں کا لگا لگایا باغ چشم زدن میں اُجڑ گیا۔ داغ صاحب حیدرآباد چلے آئے لیکن سوال سرکار مرحوم تک رسائی کا تھا، جو نہایت دشوار تھی۔ دکن کے امراان سے ملوک ہوتے تھے اور داغ صاحب معمولی حیثیت سے ایک چھوٹے مکان میں پڑے رہتے تھے۔ اُسی عالم میں وہ دس برس رہے اور سرکارِ مرحوم کے دربار تک باریابی کی کوئی صورت نہ نکلی۔ مگر اُن کی وجہ سے ملک بھر میں شاعری کا چرچا تھا، خاص بلدے میں ماہانہ طرحی مشاعرے ہوتے تھے اور داغ صاحب جس وقت اپنی غزل پڑھتے تھے، ایک سماں بندھ جاتا تھا۔ ایسا خوش گو اور قادر الکلام شاعر خانہ زاد کی نظر سے تو گزرا نہیں۔ اور صاحب زبان کا تو وہ شخص بادشاہ تھا۔ سامعین مشاعرے سے اٹھتے تو ہر شخص کی زبان پر اُن کے دو چار شعر ہوتے تھے۔ کلام میں اس بلا کی روانی اور سادگی تھی کہ میں کیا عرض کروں۔ جب پورے شہر میں اُن کی بڑی دھوم دھام سُنی تو ایک مرتبہ سرکارِ مرحوم

سے اجازت لے کر غلام بھی ایک مشاعرے میں شریک ہوا۔ سماجنگ اور سمک جنگ دو بھائی تھے۔ انھیں کی کوٹھی میں مشاعرہ تھا۔ دو بجے رات کو داؔغ صاحب نے غزل پڑھی۔ مطلعے پر ہی قیامت برپا ہو گئی۔ فدوی کو ان کا مطلع آج تک یاد ہے۔

اللہ رے تلوّن، ابھی کیا تھے، ابھی کیا ہو
شوخی ہو تو شوخی ہو، حیا ہو تو حیا ہو

سامعین بار بار پڑھواتے تھے اور داؔغ صاحب جھوم جھوم کر پڑھتے تھے۔ ساتواں یا آٹھواں شعر تھا۔

اِس دل سے مجھے لاگ ہے، بے مہر تو میں ہوں
تم شانِ وفا، کانِ وفا، جانِ وفا ہو

اس شعر پر مشاعرے میں وہ تلاطم برپا ہوا کہ نہ پوچھیئے۔ معلوم ہوتا تھا کہ سامعین پر شاعر نے جادو کر دیا۔ میرا بھی عجیب حال تھا، جی چاہتا تھا دوڑ کر داؔغ صاحب کے گلے سے لپٹ جاؤں۔

پرسش۔ "تم پھر اس حرکتِ ناشائستہ کے مرتکب تو نہیں ہوئے؟"

پیا۔ "نہیں صاحب! بھلا اِس مجمعے میں اس کا کیا موقع تھا۔"

غرضیکہ جب تمام شہر داؔغ صاحب کی شہرت سے گونج اٹھا تو ایک موقع پا کر مہاراجا سرکشن پرشاد بہادر نے سرکارِ مرحوم سے داؔغ صاحب کے کمالِ شاعری کی بڑی تعریف و توصیف کی۔ سرکارِ مرحوم نے مشتاق ہو کر داؔغ صاحب کو یاد فرمایا۔ کلام سُنا اور بے ہوش ہو گئے۔ بڑی تعریف فرمائی۔ اس دن سے داؔغ صاحب کبھی کبھی یاد کیے جانے لگے۔ خاصے میں شریک ہوتے، گھنٹوں

سرکار کے سامنے حاضر رہتے' لیکن ابھی تک نہ ملازمت ملی تھی' نہ سرکار نے انھیں کچھ عطا فرمایا تھا۔ مگر ہم لوگ جانتے تھے کہ عن قریب ان کا ستارۂ اقبال دکن کے اُفق پر چمکا ہی چاہتا ہے۔

باریابی وحاضری کو بھی ایک سال گزر گیا' اور ہم میں سے کسی کو یہ جرأت نہ ہوئی کہ داغ صاحب کی پریشان حالی کے متعلق سرکار مرحوم سے کچھ عرض کریں۔ ناگہاں سرکار مرحوم شیر کے شکار کو تشریف لے گئے' جنگل میں ان کو داغ صاحب یاد آئے۔ مہاراجا بہادر کو حکم دیا کہ داغ کو فوراً حاضر کرو۔ آدمی گاڑی لے کر بھاگے اور دو گھنٹے کے اندر اندر داغ صاحب موکب ہمایونی میں شامل تھے۔

دوسری شام کو سرکار مرحوم ایک [illegible] میدان میں کرسی پر رونق افروز تھے۔ اسٹاف کے تمام امرا دست بستہ دائیں اور بائیں کھڑے تھے۔ چابک سوار شاہی اصطبل کے گھوڑوں پر سوار' شہ سواری کے کمالات دکھا رہے تھے۔ سرکار مرحوم بہ نگاہ غور ایک ایک کے ہنر کو ملاحظہ فرما رہے تھے۔ ایک سرکش گھوڑا اپنے چابک سوار کو بہت تنگ کر رہا تھا۔ چابک سوار اپنے فن میں ایسا ہی ماہر تھا کہ میخ کی طرح اس کی پیٹھ پر جا بیٹھا تھا۔

یکایک سرکار مرحوم داغ کی طرف متوجہ ہوئے۔ فرمایا "کیوں داغ! تم بھی گھوڑے پر کبھی بیٹھے ہو؟" انھوں نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا کہ جوانی میں خانہ زاد بیٹھا ضرور ہے' مگر اس کو مدتیں گزر گئیں۔ زمانہ ہو گیا۔" ارشاد ہوا "اچھا! آج ہمیں اپنی شہ سواری

دکھائیے۔" داغ صاحب نے عرض کیا "بہت خوب۔" سرکار کے اشارے پر وہی بد لگام سرکش گھوڑا حاضر کیا گیا۔ بےچارے داغ صاحب اللہ کا نام لے کر سوار ہوئے۔ اِدھر انھوں نے باگ ہاتھ میں لی۔ اُدھر سرکار کے اشارے پر چابک سوار نے گھوڑے کو چابک رسید کی ــــ چشم زدن میں داغ صاحب زمین پر قلابازیاں کھا رہے تھے اور گھوڑا تھا کہ آندھی کی طرح جنگل کی طرف بھاگا جا رہا تھا۔

پہلے داغ صاحب اٹھائے گئے، پھر سولہ چابک سوار اپنے اپنے گھوڑوں پر اس کے تعاقب میں جنگل کی طرف بھاگے۔ بارے داغ صاحب کے چوٹ نہ آئی تھی، گرد جھاڑ کر سرکار مرحوم کے سامنے حاضر ہوئے۔ سرکار کا ہنسی کے مارے بُرا حال تھا۔ جب خوب جی بھر کے ہنس چکے تو فرمایا "تم بہت اچھا سوار ہو۔ میں تمھیں چابک سواروں کا افسر مقرر کروں گا۔" داغ صاحب آداب بجا لائے۔ پوچھا "ہماری ریاست میں کتنے دن سے ہو؟" انھوں نے عرض کیا "دس سال سے۔" سرکار نے مہاراجا بہادر کی طرف دیکھا، فرمایا "مہاراج!" انھوں نے ہاتھ باندھ کر سر جھکایا۔ ارشاد ہوا "ہم نے داغ کو ایک ہزار ماہانہ پر شاعرِ دربار مقرر کیا۔ ان کی دس برس کی تنخواہ ایک ہزار ماہانہ کے حساب سے ابھی ابھی ان کو دے دو۔" مہاراجا بہادر بہت خوب کہہ کر پیچھے ہٹے۔ اسی وقت ایک سوار خازن کے نام احکام لے کر شہر بھاگا۔ سرکار تو یہ حکم دے کر اپنے خیمے میں تشریف لے گئے۔ اُمرا نے بڑھ بڑھ کر داغ صاحب کو مبارک بادیں دیں۔

دوسرے دن بارہ بجے سارے شہر نے دیکھا کہ بنڈیوں (جھکڑوں) پر داغ صاحب کی دس سال کی تنخواہ لدی ہوئی، پولیس کے دستے کی حفاظت میں داغ کے گھر جا رہی ہے۔ عابد روڈ پر اب جس مکان میں حکیم چند وکیل رہتا ہے، اسی گھر میں داغ صاحب کا قیام تھا۔ مکان کی صورت اب تبدیل ہوگئی ہے مگر روپیہ اسی گھر میں آیا ہے، اور داغ صاحب پھر عمر بھر اسی مکان میں رہے۔

سخاوت کی بھی کیا بات ہے، جس کے ذکر سے پرنس کی محفل مہکنے لگی۔

آخر پرنس مجھ سے مخاطب ہوئے۔ فرمایا "تم خود بھی اس شعر کا مطلب سمجھتے ہو یا تم بھی نہیں جانتے کہ شاعر نے کیا کہا ہے؟"

میں نے دست بستہ عرض کیا "فدوی اپنی بساط بھر شعر کے مفہوم پر ضرور روشنی ڈالے گا۔ لیکن ظلِ سبحانی فرمانے کا سرکار کو اختیار ہے" ارشاد ہوا "بیان کرو" میں نے بہ ادب عرض کیا کہ منیر شکوہ آبادی نے جو زمانہ پایا اس زمانہ میں ہندوستان پر ملکہ وکٹوریہ کی حکومت تھی اور ملکۂ معظمہ اپنے حسن و جمال کے باعث دنیا بھر میں شہرت رکھتی تھیں۔ انھیں کی صورت ان ٹکٹوں پر ہوتی تھی جو لفافوں پر چسپاں کئے جاتے تھے۔ شاعر کا محبوب اس قدر بدگمان ہے کہ جب کبھی وہ عاشق کو اُن کے خط کا جواب لکھتا ہے تو اس اندیشے سے ٹکٹ نہیں لگاتا کہ مبادا کوئی عاشق ملکہ کے حسنِ عالم فریب پر فریفتہ ہو جائے، اور میری ذرا سی غلطی

سے میرا ایک دل ہاتھ سے نکل جائے، لہذا ہر خط پہ ٹکٹ بھیجتا ہے۔
پرنس نے ارشاد فرمایا "ابھی تصویر کی کھنگی کو تم نے صاف نہیں کیا۔ منیر نے تصویر کہنہ کیوں کہا"۔ میں نے عرض کیا کہ لفافوں کے ٹکٹ آئے دن نہیں چھپا کرتے۔ جب چھپتے ہیں لاکھوں کی تعداد میں چھپتے ہیں۔ سنہ ۱۸۹۰ء کا چھپا ہوا ٹکٹ سنہ ۱۹۰۰ء میں استعمال ہوتا ہے۔ اس لئے تصویر کی کھنگی واضح اور صاف ہے۔ پرنس خوش دلی سے ہنسنے لگے، فرمایا "فانی شعر کیا ہے چیستان ہے۔ اس کو سمجھنے سے زیادہ بوجھنے کی ضرورت ہے"۔ فانی نے دست بستہ عرض کیا "سرکار! سمجھ اور بوجھ دونوں کی ضرورت ہے۔ مگر اس شعر کے معنی ہیں بھی۔ اس کے علاوہ کوئی معنی نہیں ہو سکتے۔ فدوی کا خیال ملکہ معظمہ کی طرف نہ جاتا تھا، اور شاید مہینوں غور کرتا جب بھی نہ جاتا۔ ذہن تصویر کہنہ میں الجھ کر رہ جاتا تھا" پرنس کہنے لگے "فانی! غور کے قابل یہ امر ہے کہ کس بے ساختگی سے صدیق نے منیر کا یہ شعر پڑھا ہے، گویا پہلے سے تیار بیٹھے تھے"۔ فانی ہنس کر بولے "میں نے پہلے ہی عرض کیا تھا کہ ان کو دیوان کے دیوان حفظ ہیں"۔

اب پرنس کے اشارے پر معزز اور بندو جی کی پر گئے ساز بجنے لگا، اور سرکاری مشاعرہ شروع ہوا۔ پہلے مصرعے پر نجم آفندی داہنا ہاتھ اٹھا کر چہرے پر تاثر کی لکیریں پیدا کرتے، دوسرے مصرعے پر وہی اٹھا ہوا ہاتھ ہوا میں اس طرح گھماتے گویا انھوں نے کسی پر ڈھیلا کھینچ مارا ہو۔ انکے داد دینے کی یہی ادا تھی۔

نجم میرے مخلص دوستوں میں ہیں۔ میں ان سے مخلصانہ معذرت خواہ ہوں۔ وہ بھی گروپ میں شامل ہیں۔ مصور اگر صحیح صحیح عکاسی نہ کرے تو ناظرین اسے کب معاف کریں گے۔ صاف کہیں گے کہ تصویر ٹھیک نہیں اُتری، تم نے بلاوجہ ہمارا وقت خراب کیا۔ ایسی ہی معذرت مجھے اپنے دوست ماہر القادری سے کرنی ہے۔ جب میں نے خود اپنی کمزوری کو نہیں چھپایا تو کسی دوست کا مجھ سے میری راست گفتاری پر چیں بہ جبیں ہونا بے محل اور بے جا ہے۔ راست گفتاری واقعہ نگاری کی جان ہے۔

اسی موقعے پر میں شاہزادۂ عالی گہر اور ان کے ذی قدر بھائی سے بھی دست بستہ معافی چاہوں گا۔ اصل واقعے میں کوئی حرف گھٹاؤں بڑھاؤں تو اُن کا اور اللہ تعالیٰ دونوں کا گناہ گار ہوں گا۔ میں نے مدتوں نمک کھایا ہے خدا نہ کرے کہ نمک حراموں میں لکھا جاؤں۔ میرا مقصد تو صرف یہ ہے کہ حیدر آباد کی خوشحالی اور فارغ البالی کے حالات قلم بند کر دوں۔ پرنس مجھ پر جو مہربانی فرماتے تھے اُس کا ذکر آجائے جن لوگوں نے آنکھ سے دربار نہیں دیکھا، وہ بھی دربار کی ایک جھلک دیکھ لیں۔ جونیر پرنس آف حیدر آباد کی دریا دلی سیر چشمی، خوش اخلاقی اور شائستگی یادگار رہ جائے۔ میں نے جن لوگوں میں عمرِ عزیز کے ۲۵ سال گزارے ان کی خوش وقتیوں اور عیش رانیوں کی داستان باقی رہ جائے، اور موقعے موقعے سے اپنے ولی نعمت بادشاہ عالی جاہ کی ذہانت اور بیدار مغزی کے ذکر سے داستان کا لطف زیادہ سے زیادہ کر دوں۔

نجم اپنی سادگی اور ناتجربہ کاری اور جونیر پرنس کے مزاج میں بڑھے ہوئے دخل اور تقرب سے یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ میں آج بس عزیز

پر ہوں اس میں کبھی تغیر نہ ہوگا۔ پرنس کے ساتھ مجمع عام میں وہ برتاؤ کرتے جو استاد ایک معمولی شاگرد کے ساتھ کرتا ہے۔ اُنھیں یہ خبر نہ تھی کہ یہ دنیا ہماری دنیا سے مختلف ہے۔ بادشاہوں اور شاہزادوں کے استاد کو اُن کا وہی ادب کرنا پڑتا ہے جو ایک معمولی خدمت گار کرتا ہے۔ شاہوں اور شاہزادوں کے مرتبے تو بہت بلند ہیں۔ ان کے خادموں کے مرتبے دیکھئے۔

یمین السلطنت مہاراجا کرشن پرشاد بہادر صدر اعظم دولت آصفیہ کے دربار کا ذکر ہے۔ ایک صبح کو کم ازکم پچاس آدمیوں کی موجودگی میں جن میں مَیں بھی تھا، جوش بھی تھے، مہاراجا کی ایک نواسی، جو بمشکل چار سال کی ہوگی، دربار میں آگئی۔ ساٹھ ساٹھ برس کے بوڑھے درباری تعظیم کے لئے کھڑے ہوگئے۔ سب نے اُسی ادب سے اُس کم سن بچی کو سات سات سلام کئے، جس ادب سے مہاراجا کو سلام کرتے تھے۔ باداِ نخواستہ جوش کو بھی تقلید کرنی پڑی۔

میں عجلت میں یہ سمجھ ہی نہ سکا کہ یہ سلام کس کو کئے جارہے ہیں، مگر بہ مصداق ایک حمام میں سب ننگے، میں نے بھی درباریوں کی نقل اتاری جب اطمینان سے پھر بیٹھا تو دیکھا ایک کم سن بچی مہاراج کی گود میں بیٹھی ہے۔ اب حقیقتِ حال کو سمجھا کہ یہ تعظیم و تکریم اسی بچی کی تھی۔

دربار سے باہر نکلے تو جوش جیتھڑوں سے بیزار تھے کہنے لگے، "دیکھتے ہو یہ پھوٹی قسمت ہمیں تمھیں کس جگہ لائی ہے جہاں ایسی کم سن بچی کی تعظیم کے لئے، اٹھنے پر مجبور ہیں، جو یہ بھی نہیں سمجھتی کہ یہ کیا تماشا ہو رہا ہے۔" میں نے تسلی دی کہ بے صبری نہ کیجئے۔ دس برس بعد یہ بچی

جوان بھی ہو گئی۔ اُس وقت آپ کے سلاموں کا جواب جس خوش گوار تبسم سے دیا کرے گی وہی آج کے ان سلاموں کا انعام ہوگا۔ جوش انشاءاللہ انشاءاللہ کہتے ہوئے موٹر پر بیٹھے۔ مجھ سے کہنے لگے "ہمیں صبر کے ساتھ وقت کا انتظار کرنا ہوگا" میں نے کہا "صابرین کے بڑے مرتبے ہیں اور صبر کا پھل بھی میٹھا مشہور ہے۔" "بے شک" بے شک کہتے ہوئے جوش گھر پلٹے اور حال کا غم و غصہ مستقبل کے خوش آئند تصور میں ایسا بھولے کہ پھر اُنھوں نے کسی سے اس واقعے کا ذکر نہ کیا۔ ورنہ ان کی عادت تھی کہ جو بات خلافِ مزاج ہوتی، مہینوں احباب سے اس کا ذکر کرتے اور کڑھتے رہتے۔

اس سے لطیف تر یہ حکایت ہے کہ خلد آشیاں نواب میر محبوب علی خاں آصف سادس نظامِ دکن کی تخت نشینی نہایت کم سنی میں ہوئی تھی۔ شاید دو یا چار برس کے ہوں گے کہ دکن کی سلطنت کا بارِ گراں قدرت نے اُن کے کمزور شانوں پر رکھ دیا۔ بچہ بچہ ہی ہے، کسی جھونپڑے میں پیدا ہوا ہو یا شاہی محل سرا میں آنکھ کھولی ہو۔ تعلیم و تربیت میں سرکار مرحوم کے اساتذہ کو سخت دقت پیش آتی تھی اگرچہ اساتذہ جید علما تھے، مگر ان کو واسطہ کس سے پڑا تھا، تخت و تاج کے مالک سے جس کی مٹھی میں ان کی قسمتیں تھیں۔ سرکار مرحوم برآمد ہوتے تو اُستاد سرِ قد تک سے کھڑا ہوتا، آدابِ شاہی بجالاتا، پھر ہاتھ جوڑ کر عرض کرتا۔ سرکار تشریف رکھیں تو سبق شروع ہو۔ سرکار اُستاد کی گزارش کبھی سنتے اور بیٹھ جاتے، کبھی کھیل کی طرف طبیعت مائل ہوتی تو قطعی سماعت نہ فرماتے اور آگے بڑھ جاتے۔ اُستاد ہاتھ باندھے پیچھے پیچھے ساتھ ہو جاتا۔ کبھی محل سے برآمد ہی نہ ہوتے، وہیں کھیل میں مصروف رہتے۔

ہوا تو اہالیانِ دولت اس مشکل کو دیکھ کر بہت گھبرائے جس کا کوئی حل اُن کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ مجبوراً اس گتھی کو سلجھانے کے لئے اُمرائے سلطنت کی ایک کونسل جمع ہوئی، جس میں بڑے بڑے اُمرا شریک تھے۔ اس کونسل نے کئی دن کی بحث و مباحثے کے بعد یہ طے کیا کہ سرکار کے ہم عمر چند بچے اُن کے ساتھ اور بٹھائے جائیں۔ استاد سب کو ایک ساتھ سبق پڑھائے۔ اور جب سرکار کوئی شرارت یا ضد کریں تو دوسرے بچوں کو تنبیہ کی جائے۔ آصف سادس نظامِ دکن کے پاس بیٹھنے اور ان کا ہم سبق ہونے کی عزت عوام کے بچوں کو دی نہ جا سکتی تھی۔ اس کے لئے بڑے بڑے خاندانی امرا کے بچوں کا انتخاب ہوا۔ اب جس وقت سرکار کوئی ضد کرتے یا سبق یاد کرنے سے انکار فرماتے، اُستاد آنکھیں نیلی پیلی کر کے کمالِ بے دردی سے اُن امیرزادوں کو قمچیاں لگاتا۔ وہ بلبلا کر روتے ادھر اتالیق چپکے سے سرکار سے عرض کرتا "سرکار! آپ اپنی کتاب کی طرف متوجہ رہیں۔ مولوی صاحب اس وقت غصّے میں ہیں۔" مشہور ہے کہ سرکار مرحوم جب تک سنِ شعور کو نہ پہنچ لئے وہ امیرزادے جوان کے ہم سبق رہتے تھے، اس قولِ مشہور کے مطابق "ناحق چوٹ جُلاہا کھائے" برابر قمچیاں کھاتے رہے۔

بادشاہوں کے یہاں کے ادب و آداب یہ ہیں کہ نہ کہ اُستاد اُن کے ساتھ وہ برتاؤ کرے جو اسکول ماسٹر کلاس میں یا ایک مکتبی مُلّا مکتب میں عوام کے لڑکوں کے ساتھ کرتا ہے۔ نجم صاحب ان رموز سے بے خبر اپنے دل میں اپنا وہ وقار سمجھے ہوئے تھے، جو اُستاد کا ایک عامی شاگرد کی نظر میں ہوتا ہے۔ ایک بار خاصہ کھاتے وقت پرنس سے بے تکلف

کہہ بیٹھے "آپ کیا جانیں، میری یہی رائے ہے اور یہی درست ہے"
اتنے بلند مرتبے پر فائز ہونے کے بعد، جو دکن کے جونیر پرنس کا تھا،
یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ پرنس نہایت مہذب اور بڑے ہی عالی
ظرف تھے میری طرف دیکھ کر ہنس دئیے۔ جواباً میں بھی ہنس
دیا۔ چلئے، وہ بات گئی گزری ہو گئی۔ مگر فانی نے جہل قدمی کے
وقت مجھ سے علٰحدہ کہا، "نجم کو کیا ہو گیا ہے۔ کیا وہ سمجھتے ہیں
کہ پرنس بھی کسی اسکول کے طالب علم ہیں کہ جب جس استاد کا
جی چاہا جھڑک دیا۔ یہاں تو یہ کہنے کا محل تھا کہ فدوی اپنی
ناچیز رائے ظاہر کر چکا، اب سرکار جو مناسب اور بہتر خیال
فرمائیں۔

میں نے کہا "جلیل صاحب اعلیٰ حضرت سلطانِ دکن کی
غزلوں پر جہاں کچھ ترمیم فرماتے ہیں یہ لکھتے ہیں، سرکار کا شعر لاجواب ہے
مگر خانہ زاد کی ناقص رائے میں ایک صورت یہ بھی ہے اب سرکار
جسے پسند فرمائیں۔" فانی کہنے لگے "یہی لکھنا بھی چاہئیے۔ جب
ہی تو جلیل صاحب کی ساری عمر دربار میں بسر ہو گئی۔ ایک
ہزار ماہانہ تنخواہ پاتے ہیں۔ اگر اعلیٰ حضرت آج ان کو جواب دیدیں
تو کیا کسی دوسری سرکار میں ان کو پانچ سو کی جگہ مل سکتی ہے۔
ہمارے بادشاہ عالی جاہ کی یہ بھی پرورش ہے جو ایک شاعر
کو اتنی بڑی تنخواہ دیتے ہیں، ورنہ انصاف سے کہو کیا جلیل نہ
ہوں تو سلطنت کے نظم و نسق میں کوئی فرق آجانے کا اندیشہ ہے
"ایاز قدرِ خود بشناس"! افسوس کہ نجم صاحب اس قولِ تمثیلی بہ...

کو بھولے ہوئے ہیں۔ مجھے اس آغاز کا انجام بہ خیر نظر نہیں آتا۔" اس قسم کی باتیں فانی تنہائی میں مجھ سے اکثر کیا کرتے۔ اپنے گھر پر رات کی چہل قدمی میں یا جب میرے پاس اقامت خانے میں آجاتے۔ آخر میں مجھ سے کہتے "خدارا! نجم کو سمجھاؤ، وہ جس راہ پر چل رہے ہیں وہ نہایت خطرناک ہے۔" میں ہر مرتبہ ایک ہی جواب دیتا "مجھے ڈر ہے کہ میں اس ذکر کو چھیڑوں اور نجم کو میری طرف سے بدگمانی پیدا ہو کہ صدق بھی میرے عروج پر حد سے بڑھے ہوئے تقرب کو دیکھ نہیں سکتے۔ اس لیے چپ رہنا ہی مصلحت ہے۔"

کچھ ہی عرصہ کے بعد اسی طرح کا ایک اور واقعہ پیش آیا۔ کسی شعر میں نجم کی رائے سے پرنس نے اختلاف فرمایا۔ نجم صاحب حسب عادت اپنی بات پر اڑے رہے۔ پرنس کے ایما پر وہ قضیہ اُستاد جلیل کے آگے پیش کیا گیا۔ اُستاد تو اُستاد ہی تھے۔ اس دریافت کے بعد کہ پرنس کیا چاہتے ہیں، انھوں نے پرنس ہی کی بات کو ترجیح دی۔ اب خاصے پر پرنس نے اس واقعے کا اعادہ کیا اور کہا "فانی! اُستاد جلیل نے ہمارے موافق فیصلہ کیا ہے، لیکن ہمارے اُستاد نجم اب بھی اپنی ہی بات پر اڑے ہوئے ہیں۔" نجم نے کہا "بے شک میں جو کہتا ہوں وہی صحیح ہے۔ جلیل کی بات کو آپ آیت و حدیث سمجھیں میں نہیں سمجھتا۔" ہر شخص چپ تھا۔ کسی نے کچھ نہیں کہا۔ پرنس میری طرف متوجہ ہوئے۔ فرمایا "ہٹ دھرمی کی تو بات ہی جدا ہے۔" میں نے دست بستہ عرض کیا "بجا ارشاد ہوا"

اس طرح چھوٹی چھوٹی باتیں آئے دنوں ہونے لگیں۔ میں اور فانی اپنی اپنی جگہ افسوس کرتے، درباری خوش ہوتے، اور تنہائی میں پرنس سے نہ جانے کیا کیا کہتے ہوں گے۔

نجم اگر ذرا سی عقلِ معاملہ فہم سے کام لیتے تو بات بنی رہتی۔ شیخ سعدی علیہ الرحمہ کا مشہور قول ہے۔

اگر شہ روز را گوید شب است ایں
بباید گفت اینک ماہ و پروین

پیا کو میں نے کسی بات سے اختلاف کرتے نہ دیکھا۔ ان کی تائید کا تو یہ عالم تھا کہ اگر کسی وقت پرنس فرما دیتے کہ فانی اور صدق دونوں گردن زدنی ہیں تو پیا بے تأمل پکار اٹھتے "بہت صحیح ارشاد ہوا صاحب! فدوی کی رائے میں بھی دونوں واجب القتل ہیں۔ اگر ارشادِ اعلیٰ ہو تو خانہ زاد اپنے ہاتھ سے قتل کر دے۔ حالانکہ پیا مجھے اور فانی دونوں کو نہایت عزیز رکھتے تھے۔ مگر شاہزادے کی کسی بات سے اختلاف کرنا ان کو آتا ہی نہ تھا، اور ایسے ہی لوگ بادشاہوں کے دربار میں پھلتے پھولتے ہیں۔

کسی دوسرے موقعے پر ہماری جانیں بچانے کے لئے پیا ہی پرنس کے قدموں پر سر رکھ کر التجا کرتے "سرکار غلاموں کا قصور بخش دیں، ہم سب خاطی ہیں، خطا اور قصور ہماری سرشت میں ہے، اور سرکار کا کام خانہ زادوں کے قصور سے چشم پوشی کرنا۔ یہ سب کچھ کرتے مگر پہلے حکم پر اس کی تائید

کرنے اور بہت صحیح ارشاد ہوا کہنے سے کبھی نہ چوکتے۔

کم و بیش چار برس اسی طرح گزر گئے۔ پرنس اپنی خوش اخلاقی سے انجم صاحب کی درشتی کو نظر انداز کرتے رہے۔ لیکن ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے۔ درباری مسلسل ان کے کان بھرتے رہے۔ یہاں تک کہ ایک رات کو سرخوشی کے عالم میں پرنس نے ایک مہمانِ عزیز کے پاس کوئی پیغام بھیجنا چاہا، جس کا قیام کسی دوسری کوٹھی میں تھا۔ شیام صاحب اس کوٹھی کے مہتمم اور انچارج تھے۔

پرنس نے مصاحبوں سے پوچھا کس کو بھیجوں؟ ایک منافق نے موقع پاکر صلاح دی "سرکار! انجم صاحب نہایت موزوں ہوں گے۔" پرنس نے اپنی سادگی سے غور و فکر کے بغیر اے ڈی سی کو حکم دے دیا کہ "انجم صاحب سے کہو، ذرا تکلف فرما کر دوسری کوٹھی تک چلے جائیں اور میرا پیام پہنچا کر اس کا جواب لے آئیں۔"

اس میں کلام نہیں کہ بات بہت بے جا تھی اور کوئی مردِ شریف اس ننگ کو گوارا نہ کر سکتا تھا، مگر بدقسمتی سے انجم صاحب بھی اس وقت اس عالم میں تھے جہاں آدمی کو فکرِ انجام نہیں ہوتی۔ انھوں نے نہایت درشتی سے جواب دیا "پرنس سے کہہ دیجئے کہ یہ میرا کام نہیں۔ میرا جو کام ہے وہ مجھ سے لیجئے۔ اس کام کے لئے شیام اور پنڈت ہی موزوں ہیں۔"

اے ڈی سی واپس گئے اور تھوڑی دیر میں پلٹ کر دوسرا حکم سنایا "سرکار فرماتے ہیں، میں آج سے تم کو ایک سو پچیس

ہی تنخواہ دوں گا اور یہ کام بھی لوں گا۔" نجم صاحب اب فرطِ غضب سے رہے سہے حواس بھی کھو بیٹھے۔ کانپنے لگے اور کہا:" ان سے کہہ دو کہ جیب میں ڈھائی سو پہ اس ذلیل کام سے انکار کیا تو سوا سو پر کیا کروں گا۔" یہ کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ اُدھر پرنس اپنے کمرے سے نکل آئے اور غصے سے دریافت فرمایا:" کیا آپ کو تعمیلِ حکم سے انکار ہے؟" نجم نے اُسی سخت لہجہ میں جواب دیا:" قطعی انکار ہے۔" یہ کہہ کر سر سے دستار اور کمر سے بکلوس کھول کر صوفے پر ڈال دیا۔ پھر کہنے لگے:" یہ رہی آپ کی ملازمت، میں اپنے گھر جا رہا ہوں۔"

نجم درباریوں کی نگاہ میں کانٹے کی طرح کھٹکتے تھے۔ آج اُن کے یہاں عید تھی۔ میں اور فانی اس خبر سے دل گرفتہ ہوئے مگر تیر از کمان جستہ کا معاملہ تھا۔ ہم دونوں نجم کی شریفانہ جرأت پر دل میں خوش بھی تھے، مگر سوال اُن کے اہل و عیال کی پرورش کا تھا کہ اب بچوں اور متعلقین کا کیا ہوگا؟

اُدھر درباریوں نے ہم لوگوں کی غیر حاضری میں پرنس کے کان یوں بھرنے شروع کئے:" سرکار! نجم صاحب کی علیحدگی اچھی ہی ہوئی۔ وہ قدیم رنگ کے شعر فرماتے تھے۔" مگر پرنس کی سنتے خاموش رہے۔ نہ ڈائننگ ہال میں ان کا ذکر ہوا، نہ دربار میں۔ معلوم ہوتا تھا نجم صاحب کو دربار سے کبھی کوئی تعلق رہا ہی نہ تھا۔

کئی مہینے کے بعد خاصے پر پرنس نے اس طرح ابتدا کی:" پیا!

جس طرح صدق اور فانی کی شاعری کا تعلق دل سے ہے، ہمارے اُستاد نجم کی شاعری کا تعلق محض دماغ سے تھا۔" پیا نے اپنے مشتق فقرے کا اعادہ کیا، "بہت صحیح ارشاد ہوا۔ صاحب فدوی کا بھی یہی خیال ہے۔ ان کی شاعری محض دماغی کاوش کا نتیجہ ہوتی، اس کا دل سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔

پرنس "نگران کی استادی مسلّم ہے۔ اُن کے استاد ہونے میں کوئی شک نہیں۔" پیا (دست بستہ ہو کر) "بے شک — ! بے شک ! ان کی استادی میں کیا شک ہے۔ اس کے علاوہ ذی علم بھی ہیں۔ صاحب ! فدوی کو دو ایک بار اُن سے بات چیت کا موقع ملا تھا۔ صاحب استعداد ہیں۔ پھر چار برس سرکار کی صحبت میں رہے رنگ اور بھی چوکھا ہو گیا۔

ایرانی کی اُردو

پرنس کا ادنیٰ اشارہ پا کر درباری بات کو لے اُڑتے تھے نہ کہ ایسے صاف اور واضح ارشاد زبانی کے بعد کہ ہمارے اُستاد حضرت نجم آفندی کی شاعری محض دماغی کاوش کا نتیجہ ہوتی ہے، دل سے اسے کوئی تعلق نہیں۔ ہر طرف سے تائید ہونے لگی۔ اَلک جنگ اور ڈھمک جنگ جو خود ان دونوں قسموں کی شاعری سے بیگانۂ محض تھے، اس وثوق کے ساتھ پرنس کی

تائید کر رہے تھے کہ دیکھنے والا جانتے دونوں کے دونوں اپنے وقت کے میر اور سودا ہیں۔ میں اور فانی بالکل چپ تھے۔ پرنس نے بھی ہماری تائید کی ضرورت نہ سمجھی۔ جانتے تھے کہ یہ ہندوستانی باہم شیر و شکر ہیں۔ ایک دوسرے کی مخالفت میں زبان نہ کھولے گا۔
دربار سے نجم صاحب کے جانے کے بعد آج پہلا دن تھا کہ ڈنر ٹیبل پر پرنس نے ان کا ذکر فرمایا۔
نجم اب خانہ نشین اور ایک معمولی شہری تھے۔ وہ بھی کس شہر نا پرساں میں، حیدر آباد سے غدار شہر میں، جہاں پانچ سو روپے ماہوار کا ملازم کسی شمار و قطار میں نہیں آتا۔ اپنے دفتر میں بیٹھ کر عملے والوں پر جتنا بھی چاہے رنگ جمالے، اپنے ماتحتوں کو جس قدر بھی چاہے اکڑ فوں دکھالے، مگر دفتر کے باہر اُسے ایک بھنگی بھی سلام کرنے کا روادار نہیں۔ میں نے انسپکٹر آف اسکولس کو جو ایک ہزار روپیہ ماہوار پر تین چار سو روپے ماہوار بھتّہ اور سفر خرچ بنا لیتے تھے۔ دفتر میں اس تمکنت اور وقار سے بیٹھتے تھے کہ دیکھنے والا جانے کہ، اس ملک میں اعلیٰ حضرت سلطانِ دکن کے بعد انہیں کا مرتبہ ہے۔ ایک ایٹ ہوم میں اس بے کسی اور کس مپرسی کے عالم میں گھومتے دیکھا ہے کہ جس بڑے آدمی کو انھوں نے ادب سے سلام کیا اس نے سر کے اشارے سے جواب دے دیا۔ ہاتھ ملانا اور مزاج پرسی کرنا تو بڑی بات تھی کوئی بات کرنے کا روادار نہ ہوا۔ ہزاروں معزز اور بلند مرتبہ عہدہ داروں کے درمیان بے چارے اُس

بے بسی کے عالم میں ادھر اُدھر پھر رہے تھے، جیسے آدمیوں کے مجمعے میں کوئی برساتی مینڈک آنکلا ہو۔

ایسے شہر ناپرساں میں، ایسا آدمی، جو فکرِ معاش میں بھی مبتلا ہو، جس بے کسی کے ساتھ دن گزارے گا۔ اسی بے کسی میں اب نجم صاحب مبتلا تھے۔ کثیر العیال بیوی اور بوڑھے باپ کا ساتھ (اس وقت جناب بزم آفندی حیات تھے) تنخواہ مسدود، توکل پر زندگی، آمدنی کا کوئی دوسرا ذریعہ نہیں، سال بھر کی تنخواہ پرنس پر چڑھی ہوئی، جس کا ملنا اب محال نظر آتا تھا۔ یا تو وہ تقرّب اور وہ رسوخ کہ جو کچھ زبان سے نکل جائے، شاہزادۂ عالی گُہر اُسی کو آیت و حدیث جانیں، یا یہ حال کہ ان کو سلام تک کرنا ناممکن۔

واہ ری دنیا، چار دن کے لئے جس سے موافقت کر لیتی ہے وہ زمین پر پاؤں نہیں رکھتا۔ سمجھتا ہے کہ یہی دن اور یہی راتیں سدا رہیں گی۔ اپنا پہلا وقت بھول جاتا ہے۔ غریبوں کو کیڑے مکوڑوں کی طرح حقیر سمجھتا ہے، احکامِ شریعت کی پروا نہیں کرتا، حد یہ ہے کہ اپنے خالق تک کو بھول جاتا ہے۔

نجم جس شام و سحر اور جس رات دن کے خوگر ہو چکے تھے وہ یکسر بدل گئے۔ عادت تو اس کی تھی کہ چھ ساڑھے چھ بجے صبح کو سوئے تو چار بجے سہ پہر کی خبر لائے۔ پانچ بجے ہل فورٹ سے موٹر گئی، بکلوس کمر سے باندھ اور دستار سر پر رکھ بہ عجلت سوار ہو گئے، شام کی چائے پرنس کے ساتھ پی، جس کے ساتھ

اعلیٰ درجے کے بسکٹ، نفیس کیک، قسم اوّل کی پیسٹری، تمام خشک و تر میوے، جو بازار میں میوے ملتے ہیں وہ بھی، جو نہیں دستیاب ہوتے وہ بھی موجود ہیں۔ جو شے مرغوب خاطر ہوئی کھائی، جس چیز کی طرف رغبت نہ ہوئی نظر انداز کر دی۔ کہاں اب یہ صبح و شام اور یہ دن رات جس میں چائے کے ساتھ ایک ہی طرح کے بسکٹ، دسترخوان پر ایک ہی قسم کا سالن، نہ وہ پستئی سوپ، نہ وہ لوز نہ وہ بالائی، نہ وہ انواع و اقسام کے سالن نہ وہ طرح طرح کے خوش ذائقہ پلاؤ۔

ابوالحسن کی طرح سوتے سے جاگتے تو پھر وہی قدیم گھر، وہی اپنا کمرہ۔ نہ وہ پری چہرہ خدّام، نہ وہ قمر طلعت پیش خدمت فلک کی نیرنگی پر حیران و پریشان پکاریں تو کسے پکاریں، آواز دیں تو کس کو آواز دیں۔ کہاں مے خانے کے مالک تھے، کہاں ایک جرعے کے محتاج۔ مصیبت بالائے مصیبت یہ تھی کہ فانیناڈوم (خواب آور گولیاں) بھی بازار میں دست یاب نہ ہوتی تھیں، اور عادت پڑ جانے کے بعد اس کے بغیر نیند آنے کا نام نہ لیتی تھی۔ بے چارے رات رات بھر کھلی ہوئی چھت پر ٹہلا کرتے تھے۔ گویا یہ مشہور مطلع شاعر نے انھیں کے لئے کہا تھا۔

اکیلا صبح تک تڑپا مریض شام تنہائی
نہ وہ آئے نہ چین آیا نہ نیند آئی نہ موت آئی

کم و بیش دو مہینے اسی مصیبت میں گزرے۔ آخر یہ مشکل بھی نواب شہید یار جنگ شہید کی مہربانی سے دور ہوئی۔ انکی

سفارش پر پرنس کی طرف سے حبیب اللہ (ایک خانہ زاد) آیا۔ اور عطر دوم کی ایک شیشی کے ساتھ پانچ سو کے پانچ نوٹ دے گیا۔ لیکن یہ صورت علحدگی کے دو مہینوں کے بعد نکلی۔

تجم صاحب نے مکان کا چڑھا ہوا کرایہ ادا کیا۔ حکیم محمد عباس صاحب لکھنوی کے پاس سے جو رقم دست گرداں منگوائی تھی وہ انھیں بھجوائی۔ ڈاکٹر اختر احمد صاحب کے بلوں کا حساب چکایا۔ حکیم آشفتہ کو ان کے معاجین اور عرقیات کی قیمت بے باق کی۔ ان واقعات کے چند ہی روز بعد تجم کے نسبتی بھائی سید علی رضا کی اس وقت معقول آمدنی تھی جو اس وقت نواب ذوالقدر جنگ ہوم سکریٹری کی پیشی میں کارگزار تھے۔ ان کو بال بچوں سمیت اپنے یہاں اٹھا لائے۔ علی رضا صاحب ہوم آفس ہی کے کمپاؤنڈ میں رہتے تھے۔ اس طرح اب تجم مجھ سے بہت قریب ہو گئے۔ تعطیل کے دن کئی کئی گھنٹے میرے پاس گزارتے۔ میں ان کو دربار کے تازہ حالات سنایا کرتا۔

اب پرنس کو تجم صاحب کی علحدگی کے بعد استاد کی تلاش ہوئی۔ اب کی نظر انتخاب فانی پر پڑی۔ ہیڈ مصاحبوں کا ایک وفد فانی کے پاس گیا۔ مگر فانی اس خدمت کے لیے کسی طرح راضی نہ ہوئے۔ آخری بات انھوں نے یہ کہی کہ پرنس چاہیں تو مجھے پھانسی پر چڑھا دیں۔ یہ گردن حاضر ہے۔ مگر یہ خدمت میں کبھی قبول نہ کروں گا۔ یہ بھی فانی کی غلطی تھی۔ تجم صاحب کی دو سو تنخواہ تھی۔ لباس اور کھانا پرنس کے ساتھ تھا۔ چالیس روپے ماہانہ کرایۂ مکان کے نام سے

ملتا تھا جس کی کوئی آمدنی نہ ہو اس کے لئے یہ کیا بُرا تھا۔ لیکن انھوں نے اپنے بجائے شیام صاحب کا نام تجویز کیا۔

رات کے ڈنر میں پرنس نے فانی سے فرمایا "فانی! کیا تم مجھے بالکل بے وقوف ہی سمجھتے ہو؟" فانی گھبرا کر کھڑے ہو گئے اور ہاتھ باندھ کر عرض کیا "یہ کیا ارشاد ہو رہا ہے میری کیا مجال کہ اس طرح کا خیال بھی دل میں لاؤں چہ جائے کہ ایسا سمجھنا۔

پرنس: "پھر تم نے میری اُستادی کی خدمت کے لئے شیام کو کیا سمجھ کر تجویز کیا"؟

فانی: "سرکار ان کی حالت بے کاری کی وجہ سے قابلِ رحم تھی میں نے محض اس خیال سے کہ یہ باکار ہو جائیں گے اُن کا نام پیش کیا تھا۔

پرنس: "ان کی بے کاری اور قابلِ رحم حالت جُدا بات ہے۔ پہلے تو تم کو یہ دیکھنا چاہئے تھا کہ جس کام کے لئے مجھے آدمی کی ضرورت ہے شیام اُس کو بہ احسن وجوہ انجام بھی دے سکیں گے یا نہیں۔ مجھے تو ان کی روکھی پھیکی شاعری میں کبھی کوئی لطف نہ آیا۔ دل سے اُن کی شاعری کا کوئی تعلق نہیں۔"

میں: "(ہاتھ جوڑ کر) دماغ سے بھی کوئی لگاؤ نہیں" پرنس بے اختیار ہنس دیئے۔ فانی نے موقعے کو غنیمت جان کر عرض کیا "فدوی اپنی غلطی کا اعتراف کرتا ہے اور بہ ادب سرکار سے معافی کا خواستگار ہے۔"

پرنس : "اصلاحِ شعر کوئی ہنسی ٹھٹھا نہیں بہت مشکل کام ہے۔"
میں : "صرف اصلاحِ شعر کا معاملہ ہوتا تو بات جدا تھی۔" اب تو پرنس کے ہاتھ سے ہنسی کے مارے چھری اور کانٹا چھوٹ گئے کئی منٹ تک ہنسا کئے۔ سب مصاحب بھی ہنسنے لگے۔ فانی نے عتاب و خطاب سے فرصت پائی۔ یہی میرا منشا تھا۔ شیام صاحب البتہ نگاہِ قہر آلود مجھ پر ڈال رہے تھے لیکن میں باطمینان دسترخوان کی نعمتوں کا لطف اٹھا رہا تھا۔

فانی کے انکار کی وجہ یہ تھی کہ پرنس کی سرکار سے خدمتگاروں اور ادنیٰ ملازمین کے علاوہ کسی اور کو ماہ بہ ماہ تنخواہ نہ ملتی تھی۔ یہ عذر اُن کا قابلِ پذیرائی نہیں۔ چھ ماہی پر سہی، تنخواہ ملتی تو تھی۔ اس کے علاوہ اس خدمت کو منظور کرنے میں اُن کا پرنس سے راست تعلق ہو جاتا اور اس تعلق کے بعد پرنس ہر طرح ان کی کفالت کے ذمّے دار ہو جاتے۔ مگر اپنی بدقسمتی سے یہ سنہرا موقع بھی فانی نے ہاتھ سے کھو دیا، جس پر عجب نہیں کہ عمر بھر پچھتائے ہوں۔

آج میرے سامنے بائیں ہاتھ کی صف میں ایک ایرانی بیٹھے ہوئے نظر آئے۔ پرنس نے مجھ سے فرمایا "صدق، تمہارے سامنے یہ فلاں آغا (نام مجھے یاد نہیں رہا) جو بیٹھے ہیں یہ بیس برس سے حیدر آباد میں مقیم ہیں۔ کمال ان کا یہ ہے کہ اس مدت میں اردو ایسی صاف بولنے لگے ہیں کہ تم سُن کر حیرت کرو گے۔"
یہ سُن کر میرے دل میں ایک گدگدی سی ہوئی۔ سوپ پینے کا چمچہ ہاتھ سے ڈش میں رکھ کر دست بستہ عرض کیا "سرکار کے ارشاد

یں فدوی کسی شک وشبہ کو دخل دے تو کافر لیکن ترکِ ادب نہ ہو اور سرکار اجازت دیں تو فدوی کسی قدر جناب آغا صاحب کا امتحان بھی لے لے۔" پرنس نے فرمایا "میں بخوشی اجازت دیتا ہوں۔ تمہارا جو جی چاہے آغا سے پوچھ سکتے ہو۔" میں نے عرض کیا "زیادہ نہیں صرف ایک مصرعے کو آغا صاحب اپنی زبانِ فیض ترجمان سے دُھرادیں۔

کھاؤں کدھر کی چوٹ بچاؤں کدھر کی چوٹ"

مصرع پڑھتے ہی پرنس اپنی خداداد ذکاوت سے میری شرارت کو سمجھ گئے اور اُنھوں نے بے اختیار ہنسنا شروع کیا۔ اِدھر فانی کا ہنستے ہنستے بُرا حال ہو گیا۔ ایک منٹ کے بعد سارے مصاحب بھی بات کی تہ کو پا گئے کہ آغا صاحب "چوٹ" کی مٹی کس طرح خراب کریں گے۔ پھر تو یہ عالم ہو گیا کہ ڈرٹیبل کشتِ زعفران بن گئی جو تھا ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ تھا۔ اسی درمیان میں میں نے آغا کی طرف دیکھا۔ وہ ایسی نگاہِ غضب آلود سے مجھے گھور رہے تھے کہ بس چلے تو کچا کھا جائیں گے ہنستے ہنستے سرکار کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ خدّام تولیہ لے کر دوڑے۔ کئی منٹ کی ہنسی کے بعد سرکار اس قابل ہوئے کہ پھر اپنی ڈش کی طرف متوجہ ہوئے۔ پیتا کی طرف دیکھ کر فرمایا "پیتا حقیقت یہ ہے کہ صدق ہماری محفل کی جان ہے۔" میں اس سرفرازی پر اٹھ کر آداب بجالایا۔ پیتا نے پرنس سے میری ذہانت کی بڑی تعریف کی۔ پرنس کہنے لگے "پیتا! دیکھنے کے لائق یہ بات ہے کہ آغا کے امتحان

کے لئے مصرع وہ ڈھونڈ نکالا جس کو صحیح پڑھنا اس غریب کے بس کی بات ہی نہیں۔" بیتیا کہنے لگے "یہی تو بات ہے صاحب! خداداد ذہانت کی یہی تعریف ہے۔" فانی ہنستے ہوئے بولے، سرکار یہ (میری طرف اشارہ تھا) آغا سیّد مہدی کا ایک لطیفہ سناتے ہیں، وہ فدوی کی رائے میں اس لطیفے سے زیادہ گرم ہے۔" پرنس نے میری طرف دیکھ کر فرمایا "صدق! وہ بھی سناؤ" میں از بس مشتاق ہوں۔" میں نے عرض کیا "سرکار! مجمع عام میں سرکار کے سامنے اس کا اعادہ ترکِ ادب ہے۔" پرنس کہنے لگے "میں اجازت دیتا ہوں تم بے تکلف کہو۔"

میں نے عرض کیا "آغا سیّد مہدی ضلع رائچور میں کلکٹر تھے۔ ان کی پیشی میں ایک نوجوان ہندوستانی جو نہایت ظریف الطبع تھے، مامور تھے۔ جو اہلِ حاجت کلکٹر کے پاس کسی ضرورت سے آتے، پیش ترپیش کار سے اپنی ضرورت بیان کرتے اور انھیں کے وسیلے سے آغا صاحب سے ملتے۔ اتفاق سے ایک بار ایک نو عمر لڑکا، ذات کا مرہٹہ، حصول ملازمت کے لیے پیشکار سے ملا۔ اس کی بھولی بھالی سانولی صورت دیکھ کر دل لگی سوجھی، لڑکے سے بہ شفقت بولے میں تمھیں ابھی ابھی صاحب کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ مگر دیکھو جو بات صاحب کہیں، ہاں ضرور کر لینا۔ نہیں کی تو جان لو کہ ملازمت نہ ملے گی۔ لڑکے سے یہ قول و قرار لے کر خود آغا سید مہدی کی خدمت میں جا کر عرض رسا ہوئے "سرکار! ایک لڑکا، ذات کا مرہٹہ، ملازمت کا خواستگار

حاضر ہے۔ حکم ہو تو پیش کروں؟" آغا صاحب اس وقت شام کی چائے پی کر مسہری پر لیٹے ہوئے اخبار پڑھ رہے تھے، بولے بلالو۔ لڑکا سلام کر کے ادب سے سامنے کھڑا ہو گیا۔

آغا سید مہدی: (مسہری پر بیٹھ کر) "لڑکے! تم مَرا تا ہے؟" (تم مرہٹہ ہے)۔

لڑکا: (ایک قدم پیچھے ہٹ کر سخت اضطراب اور سراسیمگی میں) نہیں سرکار، مجھے نوکری ہی نہیں چاہیئے۔

پیش کار: (لڑکے کے کان میں) انکار نہ کر، ہاں کہہ دے ابھی نوکری ملتی ہے۔"

لڑکا: "سرکار! میں نوکری نہ کروں گا۔

آغا صاحب: سوال از آسمان وجواب از ریسمان مت کرو، تمھیں نوکری چاہیئے یا نہ چاہیئے، یہ بات جُدا ہے۔ پیش تر ہمارے سوال کا جواب دو۔ تم مَرا تا ہے (تم مرہٹہ ہے)؟"

لڑکا: (اور دو قدم پیچھے ہٹ کر) "سرکار مجھ سے یہ کام نہ ہوگا۔" یہ کہہ کر دروازے سے باہر بھاگ گیا۔ اور کئی فرلانگ تک بے تحاشا بھاگتا رہا۔

آغا صاحب: (پیش کار سے) تم کس سگِ دیوانہ کو پکڑ لائے تھے۔ جو ہماری بات کا جواب نہیں دیتا۔ اپنی کہی جاتا ہے۔ میں نوکری نہ کروں گا۔ مجھ سے یہ کام نہ ہوگا۔ ہم کونسا کام اس کے سپرد کر رہے تھے جس سے بے وقوف انکار کر رہا تھا۔"

پیش کار: (نہایت ادب سے) "سرکار! میں نہ جانتا تھا کہ

اس کے دماغ میں خلل ہے۔"

آغا صاحب : "بے چارہ دیوانہ ہے افسوس!"

پیش کار : ضرور دیوانہ ہے۔ سرکار! میں آئندہ سے بہت احتیاط کروں گا۔"

اس گرما گرم لطیفے کو سُن کر پرنس کس قدر ہنسے اور درباریوں کا کیا حال ہوا، اس کا اندازہ ناظرین خود فرمالیں۔ سب کے ساتھ حاضرالوقت آغا صاحب بھی ہنس رہے تھے۔ غالباً میری طرف سے صاف ہوچکے تھے۔ خاصہ تناول فرمانے میں جس قدر وقت گزرا، اس میں پرنس خود بہ خود ہنس دیتے تھے۔ خدا خدا کرکے ڈنر ختم ہوا۔

پرنس دربار میں رونق افروز ہوئے تو کیا دیکھتا ہوں اُس گُل عذار کی کرسی پر جو دربار میں نِرت کرتا تھا، آج ایک اجنبی لڑکا بیٹھا ہے۔ چہرے کی سیاہی سے توے کی سیاہی مات، لٹا ہوا منہ بے نور آنکھیں، سارس کی طرح دراز گردن، زرد زرد دانت، چھوٹی چھوٹی آنکھیں، ذرا ذرا سے کان، نحوست اور بدبختی کا یہ نمونہ دیکھ کر میں نے لاحول پڑھی اور منہ پھیر لیا۔

آج پرنس کا حکم پاکر مُغنّی کے بجائے وہی کلموہا چوکی پر بیٹھا، ساز بجنے لگا۔ میں زمانے کی نیرنگی پر حیران و ششدر دل ہی دل میں خمسے کا یہ بند پڑھ رہا تھا۔

محوِ شورِ زغن و زاغ ہوئے اہلِ جہاں
نغمۂ نغمہ نہ رہا، مسخ ہوئی طرزِ فغاں
لوگ ہر بوم پہ کرنے لگے، بلبل کا گماں
اسپِ تازی شدہ مجروح بہ زیرِ پالاں
طوقِ زرّیں ہمہ در گردنِ خرمی بینم

اس نے پرنس کی غزل شروع کی۔ فانی تڑپنے، اور آنگ جنگ ڈھمک جنگ اُچھلنے کودنے لگے۔ میں صوفے پر کسی قدر ترچھا ہو کر بیٹھا کہ اس کی منحوس صورت پر نگاہ نہ پڑے۔ اب میرا رُخ بالکل پرنس کی طرف تھا جن کا چہرہ چودھویں کے چاند کی طرح چمک رہا تھا۔ اتفاقِ وقت دو تین شعر اُس نے کمّو کی طرف دیکھ کر گائے۔ پرنس نے بہ آوازِ بلند متنبہ فرمایا "اِدھر دیکھ کر کیا گاتے ہو۔ کمّو کی طرف دیکھ کر گانا بھینس کے سامنے بین بجانا ہے۔ صدق کی طرف دیکھ کر گاؤ، جن سے مجھے اشعار کی داد لینا ہے۔" وائے ستم! اب صدق غریب کو اپنی نشست پر سیدھا بیٹھنا۔ اور ہر لمحہ اس کی صورتِ نجس پر نگاہ کرنا لازمی ہو گیا۔ جس مجبوری اور بے کسی سے میں اُدھر متوجہ ہوا ہوں اُسے عالم الغیب ہی خوب جانتا ہے۔ مگر سوال یہ تھا کہ کیا صدق آج رات بھر اُسی کلموہے کو دیکھا کرے گا اور بہ مجبوری دیکھا بھی کیا، تو کیا صبح تک زندہ بھی رہے گا؟

مجھے سینے میں اپنا دل ڈوبتا سا محسوس ہوا۔ لیکن چار ہی پانچ منٹ میں غیب سے مدد ہوئی۔ یعنی اس بدبخت کو دربار سے فی الفور نکلوا دینے کی ایک عجیب و غریب ترکیب سوجھی۔

اُس غزل کو تو میں نے مصلحتاً خاموشی سے سُن لیا۔ دوسری غزل کے تیسرے یا چوتھے شعر پر میں کان پر ہاتھ رکھ کر فانی کی طرف اس انداز سے جھکا، جیسے مصرعِ ثانی میرے سننے میں نہیں آیا، اور چاہتا ہوں کہ فانی دُھرا دیں۔ پرنس نے میرے اس انداز سے میری مجبوری کو تاڑ کے مصرعِ ثانی خود دُہرا دیا اور میں نے پورا شعر سُن کر مناسب الفاظ میں شعر کی داد دے دی۔ مگر پرنس کے ماتھے پر غصے کی ہلکی ہلکی دو ایک شکنیں پڑیں اور مٹ گئیں، جسے صرف میں نے ہی محسوس کیا۔ دو تین منٹ کے بعد میں نے پھر وہی حرکت کی یعنی کان پر ہاتھ رکھ کر فانی کی طرف جھکا۔ اور پھر پرنس نے خود شعر کا دوسرا مصرع پڑھ دیا۔ لیکن اب فرطِ غضب سے پرنس کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ میں یہ دیکھ کر کہ میرا وار خالی نہیں گیا، بہت خوش ہوا اور بے چین دل کو سمجھایا کہ اے دل ذرا صبر کر، میں چند لمحوں میں اس کلموہے کو دربار سے اس طرح نکلواتا ہوں کہ پھر یہ منحوس صورت مجھے تمام عمر نہ دکھا سکے۔ تیسرے ہی منٹ میں نے پھر وہی ایکٹنگ کی۔ اب کے پرنس غضب ناک ہو گئے۔ تند اور دُرشت آواز سے مُعز کو پکارا۔ مُعز گھبرا کر دست بستہ کھڑے ہو گئے پرنس کی نگاہِ غضب آلود دیکھ کر دربار میں سناٹا چھا گیا۔ مُعز کو حکم ملا کہ تم جوکی پر آؤ۔ خدّام سے ارشاد فرمایا، "نکالو اس نامعقول کو ہماری غزل کا خون کر رہا ہے۔ صدق شعر کو سُن نہیں رہے ہیں۔" سفید فام خدام نے اُس شب رنگ کو آنِ واحد میں دربار سے نکال باہر کیا۔ میرا اندازہ صحیح تھا۔ اس دن کے بعد ہل فورٹ کے اندر تو کجا محل کے ارد گرد بھی وہ کبھی دکھائی نہیں دیا۔

مُعز چوکی پر بیٹھے، ساز پھر بجنے لگا۔ میں نے اطمینان کی سانس لی اور اب بشاشت کے ساتھ سرکار کو اشعار کی داد دینے لگا۔

دوسری شام کو جب فانی میری اس غلط کاری سے آگاہ ہوئے تو سناٹے میں آ گئے، کہنے لگے "تو تم فی الحقیقت ہر شعر اچھی طرح سنتے تھے؟" میں نے کہا "کیوں نہ سنتا، کیا خدانہ کردہ بہرا اور گراں گوش تھا۔ مگر سرکار کے اس ارشاد نے کہ صدق کی طرف دیکھ کر گاؤ" مجھ پر صاعقے کا کام کیا۔ میں نے سوچا کہ رات بھر ایک منحوس صورت کو دیکھ کر زندہ رہنے سے فائنا ڈوم کی چار ٹکیاں کھا کر ابدی نیند سو رہنا کہیں بہتر ہے۔ اب میرے لئے دو ہی راستے تھے، یا خودکشی کر لوں یا اسے دربار سے نکلواؤں۔ میں نے دوسرا ہی راستہ اختیار کیا۔"

اس تشریح کے بعد فانی پر ہنسی کا دورہ پڑا۔ تادیر بے تاب ہو ہو کر ہنسے۔ جب ہنستے ہنستے بے دم ہو گئے تو کہا، ہائے نہ ہوا اس وقت جوش۔ وہ ہوتا تو تمہارا بایاں قدم لیتا۔ خدا کی قسم تم نے تو کمال ہی کر دیا۔ خدا تم کو نظرِ بد سے بچائے۔"
میں خود بھی اپنی ذہانت پر دیر تک ہنستا رہا۔ آج رات کو دربار میں کوئی قابلِ ذکر بات نہ ہوئی۔ رات ہی کی طرح اگلا دن بھی معمولی حالت میں بسر ہوا۔ البتہ قریب شام ملازم نے چائے لا کر میرے سامنے رکھی ہی تھی کہ کیا دیکھتا ہوں "کرنل جی" ایم خان صاحب سیاہ شیروانی میں ملبوس، پاؤں میں بہ قولِ خود چپلاں پہنے ہوئے، تبسّم کُناں تشریف لا رہے ہیں۔ میں نے اٹھ کر

سرو قد تعظیم کی۔ کرنل نے بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کیا اور حسبنا اللہ نعم الوکیل کہہ کر کرسی پر بیٹھ گئے۔

بیٹھتے ہی میزبانی کے فرائض کرنل نے اپنے ذمّے لے لیے۔ مجھ سے پوچھا "تمہارے لئے چائے بناؤں" میں نے کہا "نیکی اور پوچھ پوچھ" کرنل نے چائے دانی اٹھا کر پہلے میری پیالی بھری، پھر اپنی پیالی میں انڈیلی۔ دونوں پیالیوں میں اپنی مرضی کے مطابق دودھ ڈال کر شکر ملائی، پھر حسبنا اللہ نعم الوکیل کہہ کر مجھے چائے پینے کا حکم دیا۔

کرنل حیدرآباد کے قدیم شرفا سے ہیں اور ٹھیٹھ دکنی اردو میں گفتگو کرتے ہیں۔ اس خصوصیت کی وجہ سے اتنے بڑے شہر میں منفرد شخصیت کے مالک اور بہ زعم خود احباب کے لئے باغ و بہار ہیں۔ ناظرین بھی کرنل صاحب سے ہاتھ ملائیں۔ اِن کی تشریف آوری بادِ بہاری کی آمد سے کم نہیں۔ جس وقت جس دوست کے یہاں قدم رنجہ فرمایا، دم بھر میں اس کے گھر کو رشکِ گلزار بنا دیا۔ کیا عجب ہے جو یہ مصرعِ مشہور

"جس جگہ بیٹھ گئے، باغ لگا کے اٹھے"

شاعر نے انھیں سے ملنے کے بعد کہا ہو۔ ہنسنا ہنسانا یا زائچے بنانا ان کے محبوب مشغلے ہیں۔ سرکاری امتحان کے بعد طلبا کی ان کے یہاں وہ ریل پیل رہتی ہے کہ کچھ نہ پوچھئے۔ نتیجہ شائع ہونے سے پہلے لڑکے اپنا اپنا نتیجہ ان سے معلوم کرنے کے لئے ان کو صبح و شام گھیرے رہتے ہیں۔ کرنل نے دو چار باتیں پوچھ کر کچھ

اندازہ لگا لیا اور کسی سے کہتے "میاں ریاضی میں تم کمزور ہو۔ بقیہ سارے مضامین ٹھیک ہیں۔ اندیشہ صرف ریاضی میں ہے اس میں پاس ہو گئے تو پھر یقیناً کامیاب ہو۔" کسی کو یہ سبق دیا کہ اردو فارسی میں جیسا ہونا چاہیئے ویسے نہیں۔ ڈر فقط انہیں مضامین میں ہے ان میں پاسنگ مارکس لے لئے تو شرطیہ پاس ہو۔ غرض مندبا دٗ لا مشہور ہے۔ لڑکے خوشی خوشی ان کے پاس سے جاتے ہیں اور ماں باپ کو انھیں کا پڑھایا ہو سبق سُنا دیتے ہیں۔

کسی روز کسی امیر زادے کو لندن کے سفر کی خوش خبری سُنا کر نہال کر دیا۔ کبھی کسی مولوی نما تاجر کو حجِ بیت اللہ کی بشارت دے دی۔ ان کے وابستگانِ دامن دامِ زلف کے گرفتاروں کی طرح اُمیدوں کے سبز باغ دور سے ہر وقت ہی دیکھا کرتے ہیں لیکن اُس سبز باغ میں کبھی، داخلہ بھی ملتا ہے اس کا علم عالم الغیب کے سوا کسی کو نہیں۔

پنشن لینے کے بعد لوگ عموماً خانہ نشین ہو جاتے ہیں کرنل کو جس دن سے پنشن ملی ہے دن دن بھر گردش میں رہتے ہیں۔ صبح کے نکلے جس روز شام کو واپس آگئے تو جانیئے کہ کچھ نہیں پھرے ورنہ عموماً دس بجے رات سے پہلے نہیں پلٹتے۔

چائے کے دو گھونٹ پی کر کرنل گرمائے۔ فرمایا "یا بولوں بھئی (بھائی) تم ہنسیں گے نہیں تو اپن بھی کچھ شعراں بولتے (تم ہنسو گے ورنہ ہم بھی کچھ اشعار سُناتے)۔

میں: کرنل صاحب میں سراپا مشتاق ہوں۔ ہنسنے کا بھلا

کیا موقع ہے۔ آپ ضرور سنائیے۔
کرنل: اچھا تو سنو۔

تکلف سے ڈوپٹہ آج رنگواتے ہیں وہ دھانی
خدا جانے پڑے گا کس کے سوکھے دھان میں پانی

ہنسی کے مارے میرا بُرا حال ہو گیا۔ کرنل خود بھی اس ہنسی میں برابر کے شریک تھے۔ آخر بات بنانے کی خاطر میں نے کہا "کرنل صاحب یہ خدا کمال ہے۔
کرنل: "بھائی یہ شعراں کمالاں کرتے ہیں۔ حسبنا اللہ و نعم الوکیل۔"
میں: "کرنل صاحب شاعری کی حمیّت اور غیرت کی بھی قسم کھانے کو جی چاہتا ہے۔ کس بے تکلفی سے فرمایا ہے کہ وہ بن سنور کر نہ جانے کس کا ہلو گرانے جانے والے ہیں۔"
کرنل: "ایسا نکو بولو بھئی، کسی اُستاد دے شعر اسا ہی۔"
میں: "اس استاد پر خدا کی رحمت ہو۔"
کرنل: "حسبنا اللہ و نعم الوکیل۔ بولو آگے بولوں یا نکو بولوں (کہو آگے پڑھوں کہ نہ پڑھوں)۔
میں: "ضرور پڑھئے۔ ایسے اشعار سننے میں کہاں آتے۔"
کرنل: "سنو!

کہا اُن سے میں دل ہے شیدا تمہارا
وہ بولے بگڑ کر، کلیجا تمہارا"

میں: "یہ خدا مطلع نہیں مطلع آفتاب ہے۔ کیا روانی اور کیا

برجستگی ہے۔ کرنل صاحب نازِ معشوقانہ کی اس سے بہتر مصوری ممکن ہی نہیں۔ سُبحان اللہ! سُبحان اللہ!"

کرنل: "حسبنا اللہ ونعم الوکیل۔ بولو اور لُولُون۔"

میں: "ابھی تو اس کو بار بار پڑھے جائیے۔ کیا شعر سُنایا ہے آپ نے ابھی اسی سے سیری نہیں ہوئی، آگے سننے کا کسے ہوش ہے۔"

کرنل نے کئی بار مزے لے لے کر یہی شعر سُنایا، اور مجھ سے جس قدر ہنسا گیا، جی بھر کے ہنس لیا۔

کرنل: "آگے بولتا ہوں۔"

میں: "میں ہمہ تن گوش ہوں۔"

کرنل: ہشیار اس قدر ہوں کہ کاٹے ہیں اسکے کان
کوچے میں تیرے مثل سگِ دم بریدہ ہوں"

اس شعر کو سن کر میرا کیا عالم ہوا، اس کو لفظوں میں بیان کر دینا مشکل ہی نہیں بلکہ محال ہے۔ صرف ایک ہی طریقہ اُس حالت یا کیفیت کے اظہار کا ہے۔ وہ یہ کہ بہ فرضِ محال اگر کرنل آپ ہی کو یہ شعر سُناتے تو جس قدر مسرور یا محظوظ آپ ہوتے، بس اتنا ہی لطف میں نے اٹھایا۔ کسی قدر میں نے شعر کی خوبیوں پر بھی روشنی ڈالی۔ یعنی کرنل کی توجہ دلائی کہ کُتّے کی وفا مشہور ہے اور شعرا اہلِ وفا ہی میں اپنا شمار کرتے ہیں۔ پہلا کمال تو شاعر کا یہ ہے کہ اس نے اپنے آپ کو کُتّے سے تشبیہ دے کے معشوق پر اپنی وفا کا سکّہ بٹھا دیا۔ دُم بُریدہ میں جو معنویت اور مزہ ہے اُسے ہر وہ شخص سمجھ سکتا ہے جس نے دُم کٹے کُتّے دیکھے ہیں۔

مصرعِ اولیٰ میں کان کاٹنے کا محاورہ ایسا با محل ہے جیسے انگوٹھی میں نگینہ کیونکہ دُم کی طرح کتّے کے کان، کاٹ دینے کا بھی دستور ہے۔ اُس کے علاوہ کتّے سے تشبیہ دینے کا دوسرا فائدہ یہ بھی ہے کہ سگِ لیلیٰ کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ اگر وہ شاعر کو کتا ہی سمجھ کر در پر پڑا رہنے دیں تو اس کا مطلب حاصل ہو گیا۔ غرض جتنا سوچیے اُتنا ہی شعر کے اندر لطف اور مزہ ہے۔ کرنل اس تشریح سے بے حد خوش ہوئے۔ فرمایا "اپن یہ باتاں کیا سمجھتیں۔"

اب میں نے گھڑی دیکھی۔ کرنل نے معاً سوال کیا۔ "تمہاری گھڑیاں میں کیا بج رہا ہے۔ (مطلب یہ کہ تمہاری گھڑی میں کیا وقت ہے)۔" میں دل میں لوٹ پوٹ کہ سبحان اللہ! گھڑیاں کیا ہوئی گراما فون ریکارڈ ہو گیا جس میں کوئی نہ کوئی گت بجتی رہتی ہے مگر جواب دینا ضروری تھا۔ اس لیے کہنا پڑا کہ ساڑھے چھ بجے ہیں مگر فوراً اس ڈر سے کہ کرنل کہیں پھر شعر خوانی کی طرف مائل نہ ہو جائے اُن سے سوال کر بیٹھا "یہ فرمائیے کرنل صاحب آج کدھر کدھر کا دورہ رہا۔"

کرنل: "اپن کیا بولیں بھئی۔ بلگرامی صاحب بہت دناں سے بول رہے تھے کہ سب کو زائچہ بنا کر دیتیں اور ہمارے کو نئیں — اُن کو اپن سے بڑی شکایتاں تھے۔ تو اپن آج سب کاماں چھوڑ کر ان کے لوگاں کے زائچے بنا کر لائے تھے۔ حسبنا اللہ ونعم الوکیل۔"

میں: "پھر تو آج بڑی گلجھپ رہی ہو گی۔"

کرنل: "کیا بولوں بھئی۔ بڑی گمت آئی (بڑی چہلس رہی یا بڑا مزہ آیا) سب جناں (سب لوگ) مل کر بیٹھ گئیں، اور لگے بولناں

مارنے (شوروغل کرنے) اِنوں بولتے پہلے اَپن کو بتاؤ' اُنوں بولتے پہلے اَپن کو بتاؤ۔ اَپن بولے بھئی بوماں نکو مارو (غل غپارہ نہ کرو) حسبنا اللہ ونعم الوکیل۔

"ایک ایک جنے سہاٹالا کرکو گئے۔ انھیں باتاں میں ایک پر اَڈّھا بج گیا (ڈیڑھ بج گیا)۔ اب سب جناں مل کر بولتیں' کرنل! کھانا کھاکو جاؤ۔ میں بولا' یہ سب زحمتاں کائے کو۔ اَپن گھرا میچ آدمیاں (یہ تو ہمارا گھر ہے آپ لوگ کوئی غیر نہیں)۔ پھر یہ سب تکلّفاں کائے کو تو بی (پھر ان تکلّفات کی کیا ضرورت ہے)۔ پَن کی مگر اُنوں لوگاں جب بہت بولا (مگر جب سب نے بہت اصرار کیا) تو اَپن کھانا کھالئے۔ حسبنا اللہ ونعم الوکیل۔"

میں: "تو یہ کہیے آپ دعوت کھاکر تشریف لارہے ہیں؟"

کرنل: "کیا بولوں بھئی (بھائی)۔ مٹی پڑو ایسی دعوت پو سب میٹھے سالناں' سب میٹھے سالناں' یہ خورمہ ہے' وہ خلیہ ہے' یہ خیمہ ہے' نہ چگر' نہ کھٹّا چکّا' نہ امباڑے کی بھاجی' نہ کاٹ ماٹ کی بھاجی' نہ کوئی اچاراں حسبنا اللہ ونعم الوکیل۔"

(ترجمہ) ایسی دعوت پر خاک' ہر سالن میٹھا' یہ قورمہ ہے' وہ قلیہ ہے' وہ قیمہ ہے' نہ چگر' نہ کھٹّا چکّا۔ نہ امباڑے کا ساگ' نہ کاٹ ماٹ کا ساگ' نہ کسی قسم کا اچار۔

"نہ دستر (دسترخوان) پر جھینگا' نہ مچھی' نہ دَھی' نہ ٹماٹا۔ حسبنا اللہ ونعم الوکیل۔ ترجمہ (نہ جھینگے' نہ مچھلی' نہ دہی کی چٹنی نہ ٹماٹر کی) اور اَپن کو اوپر سے چڑلانے کو کیا بولتیں کی' کرنل! یہ جوزی حلوا

سوہن ہے، یہ کپتان کے کنوئیں کی برفی ہے، یہ شاہی ٹکڑے ہیں، یہ سیب کا مربّہ ہے۔ کرنل یہ بھی چکھو، وہ بھی کھاؤ۔ یہ سب تکلفات ال کاٹے کو توبی۔

اپن کو غصہ تو بہت آیا مگر ہو ہو کر کے اٹھ گئے، حسبنا اللہ ونعم الوکیل (یعنی میزبان کی پاسِ خاطر سے ہم غصّے کو پی گئے اور ہاں ہاں کر کے دستر خوان سے اٹھ کھڑے ہوئے)۔

ہنستے ہنستے میرے پیٹ میں بل پڑ گئے۔ میں نے کہا ــ، کرنل صاحب! خدا کے لئے اب اس دعوت کی تفصیلات میں نہ جائیے۔ آج تو آپ نے ہنسا ہنسا کے مار ڈالا۔" کرنل جامے میں پھولے نہ سماتے تھے۔ سمجھتے تھے کہ ہم نے اپنے علمِ مجلس سے ان کو اس قدر مسرور کیا۔ اسی مسرّت میں کرنل نے نواب شہاب جنگ مرحوم کے دربار کے حالات سنا ڈالے۔ جن کی محل سرا کے قریب کرنل بچپن میں رہا کرتے تھے۔ وہ حالات ناظرین میری زبان سے سُنیں کیونکہ نہ اب مجھ میں کرنل کی زبان لکھنے کی طاقت ہے نہ قلم کو اس کی نقل کرنے کا یارا ہے۔

نواب شہاب جنگ

نواب شہاب جنگ، آصفِ سادس نواب میر محبوب علی خاں خلد آشیاں کے عہدِ دولت مہد میں حیدر آباد کے ایک امیر با توقیر اور صیغۂ پولیس کے وزیرِ خوش تدبیر تھے۔ خاندانی وجاہت

وہ قار پر ان کے ذاتی خدمات اور نمک حلالی نے چار چاند لگا دئے تھے۔ ایک طرف اعلیٰ حضرت مرحوم ان کو عزت و احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔ دوسری طرف رعایا ان کے گن گانے سے سیر نہ ہوتی تھی۔ شہاب جنگ کی دولت سرا بھی شاہی محل سرا سے قریب ہی تھی۔

سہ پہر ہی سے شہاب جنگ کے محل میں روشنی کا عملہ مصروف کار نظر آتا تھا۔ کیونکہ مردانہ حصے سے زنانی محل سرا تک سینکڑوں شمعیں مومی اور کافوری قیمتی قندیلوں اور بیش بہار دیوار گیریوں میں سرِ شام روزانہ روشن ہوتی تھیں۔

خاص شہاب جنگ کی نشست گاہ میں دو بیش قیمت بلوری جھاڑ آویزاں رہتے تھے۔ ہر جھاڑ میں بتیس بتیس خوبصورت اور خوش رنگ کنول جن پر نقرئی اور طلائی کام بنا ہوا نصب تھے۔ یہ جھاڑ رات بھر وہ نور افشانی اور ضیا باری کرتے تھے کہ اتنے حصے پر دیکھنے والوں کو دن کا دھوکا ہوتا تھا۔ ان بیش قیمت جھاڑوں کی ٹھنڈی روشنی میں بیسیوں خوش رنگ قندیلوں اور خوش وضع فانوسوں کی ضیا پاشی اور نورٌ علیٰ نور کا مصداق تھی۔ اس چراغاں کا باعث یہ تھا کہ شہاب جنگ کُل کام ذاتی ہوں یا سرکاری رات ہی کو انجام دینے کے عادی تھے۔ احباب سے ملاقاتیں، جاگیرات کے کارپردازوں کو ہدایتیں، امیدوارانِ ملازمت کو تسلیاں، رات ہی میں دیتے تھے۔ دوستوں کے خطوط کے جوابات اسی وقت لکھواتے تھے۔ مقدمات کی سماعت اور ان کے فیصلوں کا وہی وقت ہوتا تھا۔ کوتوالِ شہر کے دن بھر کی رپورٹ پر حکم احکام ا[illegible] سے

اجلاس سے رات ہی کے سناٹے میں جاری ہوتے تھے۔ "سونا سنسار، جاگتا پاک پروردگار" کی مشہور کہاوت کو ان کے عہد والے زبان پر نہ لاتے تھے۔ کیونکہ پروردگار عالم کی بیداری میں نہ صرف شہاب جنگ ہی تنہا شریک رہتے تھے، بلکہ ان کی وجہ سے سینکڑوں بندگانِ خدا اور بھی ساری رات دن کی طرح مشغول بہ کار رہتے تھے۔ اُن کے سکریٹری، پیش کار، فیصلہ نویس، اہل کارانِ عدالت اور وزارتِ صیغۂ پولیس کا پورا عملہ پوری پوری راتیں آنکھوں میں کاٹنے کا عادی تھا۔

دولت کدے کے بیرونی کمپاؤنڈ میں صاحبانِ حاجت، اہلِ معاملہ، وکلا، موکلین اور عہدہ دارانِ پولیس کا وہ جماؤ رہتا تھا کہ دیکھنے والے کو شاہ مینا کے مزار کی نوچندی یاد آجاتی تھی۔ اہل حرفہ کی پچاسوں دکانیں احاطے کے اندر رات رات بھر کھلی رہتی تھی، جن میں ضرورت کی ہر شئے دستیاب ہوتی تھی۔ مگر جس چیز سے شہاب جنگ کا نام روشن ہے وہ ان پرستاروں کی قطار تھی جو اجلاس کے دروازے سے زنانی ڈیوڑھی تک بڑی باضابطگی سے رات بھر کھڑی رہتی تھی۔ ہر تین چار گھنٹے کے بعد اُن کی ڈیوٹیاں تبدیل ہوتی رہتی تھیں۔ یعنی جو لوگ پہلے کھڑے ہوتے تھے اُن کی جگہ تازہ دم پیش خدمت آجاتے تھے تاکہ پہلے والوں کو آرام لینے کا موقع مل جائے۔

خدام کی یہ وردی پوش پلٹن محض نمود و نمائش کے لیے نہیں ہوتی تھی، بلکہ ان کا ایک مصرف تھا، جو شہاب جنگ سے پہلے شاید ہی کسی امیر کے ذہن میں آیا ہو۔ تاریخ میں تو کسی فرماں روا کی زندگی

میں بھی ایسا اہتمام و انتظام نظر نہیں آتا۔ اجلاس میں جس چیز کی ضرورت محسوس ہوتی اس کا مہیا کرنا انھیں پیش خدمتوں کے سپرد تھا۔ مثال کے طور پر کام کرتے کرتے شہاب جنگ کو پیاس معلوم ہوئی۔ انھوں نے اردلی کو حکم دیا پانی منگواؤ۔ اردلی اجلاس کا دروازہ کھول کر چیخا آبِ خاصہ لاؤ۔ اسی آواز کو صفِ خدام کے پہلے آدمی نے دہرایا "آب خاصہ لاؤ" ۔ پھر کیا تھا دوسرے سے تیسرے نے اور تیسرے سے چوتھے نے یہی فقرہ دہرانا شروع کر دیا۔ جیسے لڑکوں کے کھیل میں ہاتھوں ہاتھ گیند جاتا ہے۔ یا مشاعرے میں سامعین شاعر کا مصرع اٹھاتے ہیں "آبِ خاصہ" کی آواز زینہ بہ زینہ چلتے چلتے آب دار خانے میں جا کر گونجی۔ اور مہتمم آب دار خانہ نے جھٹ چاندی کی ایک خوبصورت کشتی میں نقرئی گلاس پانی سے بھر کے نہایت تکلف و اہتمام کے ساتھ اپنے آدمی کے حوالے کیا ــــ وہ وردی پوش ملازم جوں ہی آب دار خانے کے باہر نکلا صفِ خدام کے پہلے آدمی نے ہانک لگائی "آبِ خاصہ حاضر ہے۔ اس آواز کی گونج ہنوز ختم نہ ہونے پائی تھی کہ دوسرے نے، اور اس سے تیسرے چوتھے اور پانچویں نے یہی مصرع اٹھانا شروع کر دیا۔ حتیٰ کہ رفتہ رفتہ آبِ خاصہ اجلاس تک پہنچا۔ اب اردلی کی باری تھی۔ جس آواز سے وہ اہل مقدمہ کو پکارنے کا عادی تھا اُسی آواز میں اُس نے شہاب جنگ کو مطلع کیا "آبِ خاصہ حاضر ہے" ۔ اس کی درشت اور ہیبت ناک آواز سے جو وکلا اجلاس کے باہر اونگھ رہے تھے چونک پڑے۔

تھوڑی دیر میں شہاب جنگ نے پان مانگا۔ اردلی باہر نکل کر للکارا' خاصے کے پانان لاؤ"۔ اب یہ آواز بہ تدریج فضا میں گونجنی شروع ہوئی اور زنانی ڈیوڑھی تک دہن بہ دہن یا حلق بہ حلق پہنچی۔ دس منٹ بعد ادھر سے شور بلند ہوا "خاصے کے پانان حاضر ہیں" خدا خدا کر کے پان بھی شہاب جنگ تک پہنچے۔ کچھ دیر میں تیسرا شور مچا "خاصے کے سگاراں لاؤ" تھوڑی دیر میں زنانی ڈیوڑھی سے یہ شور اٹھا "خاصے کے سگاراں حاضر ہیں۔ غرض گیارہ بجے رات سے پانچ بجے صبح تک شہاب جنگ کی ڈیوڑھی میں یہی ہنگامے بپا رہتے تھے۔

پیسا کہتے تھے" ایک سہانی رات کو دو کا عمل ہوگا اور سرکار مرحوم شب ماہ کا لطف اٹھانے اپنے محل کی چھت پر رونق افروز ہوئے۔ ناگاہ پڑوس سے آب خاصہ حاضر ہے' شور بلند ہوا' سرکار مرحوم نے میری طرف دیکھ کر دریافت فرمایا' یہ کون لوگ شور کر رہے ہیں' میں کچھ کہنے نہ پایا تھا کہ شمشیر جنگ مرحوم نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا' خداوند نعمت! نواب شہاب جنگ نے اجلاس پر پانی مانگا ہوگا۔ اُن کے لئے پانی آب دار خانے سے جا رہا ہے' یہ شور اسی پانی کی حاضری کا ہے۔ سرکار اس وقت تو مسکرا کر خاموش ہو رہے۔ مگر ایک شام شہاب جنگ سرکار کی خدمت میں حاضر تھے سرکار کو اس رات کا غل غپاڑہ یاد آ گیا۔ فرمایا' شہاب جنگ تیرے یہاں رات بھر وہ شور و غل رہتا ہے جس سے ہماری نیند حرام ہو گئی ہے۔ مکان کیوں نہیں بدل دیتا کہ ہم آرام سے سو سکیں"۔

شہاب جنگ ہاتھ باندھ کر عرض رسا ہوئے" خداوند نعمت!

غلام کے پاس ایک ہی جھونپڑا ہے۔ اسے بھی چھوڑ دے تو سر چھپانے کے لئے کہاں جائے۔ سرکار کے پاس ماشاءاللہ پچاسوں محل ہیں خانہ زاد کو یہ بات تعجب ہوتی تو تعمیلِ حکم میں آج ہی نقلِ مکان کر دے۔ منشا یہ تھا کہ نقلِ مکان آپ کے لئے زحمت طلب نہیں آپ ہی دوسرے محل میں کیوں نہ اٹھ جائیں۔ سرکارِ مرحوم بھی کیسے بندہ پرور آقا تھے تبسم فرما کر چپ ہو گئے۔ اس حکایت سے شہاب جنگ کے تقرب اور اس قدر و منزلت کا اندازہ ہوتا ہے جو اُن کی سرکار کے دل میں تھی۔

شہاب جنگ کی مان دان کا ایک اہم واقعہ ناظرین دیکھ چکے۔ دو چھوٹے چھوٹے واقعات جو اس سے بھی اہم ہیں اور سن لیں۔ اِن واقعات سے اُن کی شخصیت اور اُن کے وقار کا کافی اندازہ ہوتا ہے۔

ایک اُمرائے دکن کی کمیٹی میں کوئی ایسا ہی اہم مسئلہ زیر بحث تھا کہ اُس کی صدارت آصفِ سادس نواب میر محبوب علی خاں خُلد آشیاں خود فرمانے والے تھے۔ مگر عین وقت خدا جانے کس مجبوری سے سرکار مرحوم شرکت نہ فرما سکے۔ لیکن سرکار یہ بھی نہ چاہتے تھے کہ معاملہ جوں کا توں معلق رہے۔ ان حالات میں سرکار نے اپنے چیف سکریٹری مولوی احمد حسین کو حکم دیا کہ میرے بجائے تم چلے جاؤ۔ میں تمہاری زبانی کمیٹی کی روداد سُن کر فیصلہ کر دوں گا۔ مولوی احمد حسین کمیٹی میں گئے اور تمام ممبران کو سرکار کا حکم زبانی سُنا کر صدارت کی کرسی پر بیٹھ گئے۔

نواب شہاب جنگ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے،

کہا کہ شہاب جنگ کی زندگی میں یہ ناممکن ہے کہ امرا کی کمیٹی کی صدارت کوئی تنخواہ دار ملازم کرے۔" مولوی احمد حسین سے مخاطب ہو کر کہا" اس کمیٹی میں حیدر آباد بھر کے چوٹی کے امرا شریک ہیں ان کی قسمتوں کا فیصلہ آپ فرمائیں گے، جو محض تنخواہ دار ملازم ہیں۔ تنخواہ آپ کی تین ہزار ہو یا پانچ ہزار، مگر ہیں ملازم ہی۔" مولوی احمد حسین، بہت سٹپٹائے، کہا "میں سرکار کے حکم سے حاضر ہوا ہوں" شہاب جنگ بولے "میں سرکار کو جواب دے لوں گا، آپ واپس جائیے۔"

مولوی احمد حسین نے واپس آکر سرکار کو جو کچھ گزرا تھا، کہہ سنایا، بلکہ اصل واقعے میں کچھ اپنی طرف سے بھی نمک مرچ لگایا، سرکار، شہاب جنگ کی یہ زیادتی سن کر آگ ہو گئے۔ فرمایا، شہاب جنگ کو ابھی حاضر کرو۔ شہاب جنگ حکم پاتے ہی حاضر ہوئے۔ سرکار نے ان سے یہ عتاب خطاب فرمایا "کیوں شہاب جنگ! یہ کیا بات ہے، تو نے ہمارے حکم کی بھی کوئی پروا نہ کی۔ ہمارے بھیجے ہوئے آدمی کو واپس کر دیا۔"

شہاب جنگ نے دست بستہ ہو کر عرض کیا "خداوند نعمت! اس کمیٹی میں حیدر آباد بھر کے امرا، موجود تھے۔ غلام اس ذلت کو کیوں کر گوارا کرتا کہ ان میں ایک تنخواہ دار ملازم کو بھی بیٹھنے دیتا۔"

شہاب جنگ ہاتھ جوڑ کر بولے "مالک! خانہ زاد کو اچھی طرح معلوم ہے لیکن سرکار کی جوتی کے لئے شہاب جنگ ہی کا سر ہی موزوں ہے۔ یہ بات سرکار کے اختیار کی نہیں کہ جس پر چاہیں جوتی رکھ دیں۔"

چلیے غصے کی آگ ٹھنڈی ہوگئی، سرکار مسکرا دیے۔ شہاب جنگ اپنی کامیابی پر شاداں و نازاں گھر پلٹے۔ مولوی احمد حسین کی قسمت میں جو تذلیل و توہین کاتب تقدیر لکھ چکا تھا، اس کا مداوا کچھ نہ ہوا۔ وہ شکایت کر کے پچھتائے۔

شہاب جنگ کا دوسرا واقعہ اس سے بھی زیادہ پُرلطف ہے۔ اِک بار کسی بات پر اکبر جنگ کوتوالِ شہر سے برہم ہو کر شہاب جنگ نے ایک روپیہ جرمانہ کر دیا۔ کوتوالِ بلدہ اور انسپکٹر جنرل پولیس کی حیدر آباد میں مساوی پوزیشن ہوتی تھی۔ اکبر جنگ اس زیادتی پر بہت جز بز ہوئے۔ سرکار مرحوم سے فریاد کی۔ جب شہاب جنگ سرکار کے سلام کو حاضر ہوئے۔ تو سرکار نے اکبر جنگ کے متعلق فرمایا کہ وہ ہمارا معتمد اور خیر خواہ ہے۔ ایسے نمک حلال پر تم نے ایک روپیہ جرمانہ کیا ہے۔ شہاب جنگ نے کہا "بہت خوب! خانہ زاد اس کے معاملے پر مکرر غور کرے گا۔" اور پیشی سے واپس آ کر ان کی مسل پر یہ حکم لکھا "آٹھ آنے معاف کئے گئے، صرف آٹھ آنے اکبر جنگ جرمانہ داخل کریں گے۔" اور نواب اکبر جنگ بہادر کوتوالِ بلدہ حیدرآباد کو جو دو ہزار روپے ماہانہ کے تنخواہ یاب تھے۔ آٹھ آ۔نے داخل کرنا پڑے۔

شہاب جنگ اس کلّے ٹھلّے کے امیر اور بادشاہِ وقت

سکتے مزاج میں اس قدر دخیل تھے۔ لیکن دنیا نے سدا کس کے ساتھ وفا کی ہے کہ شہاب جنگ ہی کے ساتھ نہ ہوتی۔ سرکار مرحوم کی وفات کے بعد وہی شہاب جنگ، جن کے اعزاز و وقار کے ملک میں ڈنکے بجتے تھے، یک بہ یک ایسے قعرِ مذلت میں گرے کہ پھر جیتے جی کسی کو صورت دکھانا پسند نہ کیا۔ جب قیدِ حیات کی میعاد پوری کر چکے، تو دم بھر کے لیے، تابوت کے اندر لیٹ کر بے شک باہر آئے۔ مگر داورِ غیرت، اس وقت کفن سے اپنا منہ ڈھانکے ہوئے تھے۔ دیدار کے مشتاق بعدِ مرگ یوں دیدار سے محروم رہے۔ دنیا میں بے شمار راتیں جاگ کر گزاری تھیں اب کنجِ لحد میں، بہ آرام محوِ خواب ہیں۔ جزا کا دن بہت دور نہیں۔ اس روز ایک بار پھر شہاب جنگ بے نقاب و بے حجاب مجمعِ عام میں اپنی صورت دکھائیں گے۔ جن کو ان کے دیکھنے کی حسرت ہے وہ اس دن دیکھ لیں گے۔

شہاب جنگ کا وہ تاریخی محل، جس کی ہر رات شب برات سے بہتر ہوتی تھی، آج جس کس مپرسی کے عالم میں ہے، اس کے ذکر سے جگر پاش پاش ہوتا ہے۔

۱۹۵۳ء کی ایک شام کو سید برکت علی صاحب جاگیردار اور خواجہ معین الدین صاحب جیسے دوستانِ یک رنگ کے ساتھ میں نے اس کھنڈر کو دیکھا۔ خواجہ بتاتے جاتے تھے، یہ شہاب جنگ کا جلو خانہ تھا، یہ وہ برآمدہ تھا جہاں پرستاروں کی قطار کھڑی ہوتی تھی، یہ اسپ دار خانہ تھا، وہ زنانی ڈیوڑھی ہے، یہ تبدیل لباس کا کمرہ ہے، اس کمرے میں اُن کے ملاقاتی بیٹھتے تھے، یہ ڈائننگ

ہال ہے۔ یہاں نماز پڑھا کرتے تھے۔ بعض حصوں کے صرف ستون کھڑے رہ گئے تھے۔ بعض کے کھمبے بھی گر چکے تھے۔ کسی کمرے پر چھت سلامت نہ رہ گئی تھی۔

اتنے بڑے امیر کی دولت سرا کا یہ حال دیکھ کر دل پر جو کچھ عالم گزر گیا، اس کے اظہار کے لئے الفاظ کہاں سے لاؤں۔ بے اختیار جی چاہتا تھا کہ ان ٹوٹے ہوئے کھمبوں کو گلے سے لگالوں اور چیخ چیخ کر روؤں۔ ایک ایک طاقِ شکستہ کے سامنے پچھاڑیں کھاؤں، ایک ایک اینٹ پر سر دے ماروں۔ دل تھا کہ اُمڈا آتا تھا، آنسو رُکے نہ رکتے تھے، مگر بڑے ضبط و تحمل سے کام لیا۔ "دنیا اور امارت دنیا پر لعنت بھیج کر اُن دوستوں کے ساتھ جو اُس شام کو میرے رفیق تھے، اُس کھنڈر سے نکل آیا۔ اِسی چار دن کی چاندنی پر اہلِ دوَل اِتراتے ہیں، اور غریبوں کو غبارِ راہ سے زیادہ حقیر اور بے قدر جانتے تھے۔ افسوس۔ صد ہزار افسوس!

شہاب جنگ کی دولت سرا کو کھنڈر دیکھ کر گھر پلٹا تو بے حد دل گیر اور اُداس تھا۔ نہ کھانے میں کوئی لذت پائی، نہ احباب سے جی بہلا۔ دنیا ہیچ و پوچ معلوم ہوئی۔ ظاہری شان و شوکت جس کا اب تک دل دادہ تھا، بے قدر و بے وقعت محسوس ہوئی۔ آنکھیں جن فراعنہ کو دیکھنے کی عادی تھیں، وہ نرے سوکھے دبہروپیے نظر آئے۔ اہلِ حشم جن کی ایک ایک ادا میں دل رُبائی اور کشش پاتا تھا، سانپ اور بچھو کی طرح گھناؤنے دکھائی دئے۔ آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری تھے اور زبان پر یہ شعر تھا ؎

گیا حُسن خوبانِ دل خواہ کا
ہمیشہ رہے نام اللہ کا

اُسی عالمِ محویت میں دُنیا کی بے ثباتی سے متعلق چند اشعار میرے قلم سے ابھی ٹپک پڑے جنھیں دوسرے دن مربوط کر کے میں نے "تازیانۂ عبرت" نام تجویز کیا۔ کیا عجب ہے کہ ناظرین بھی اُن سے عبرت و نصیحت حاصل کریں۔ پوری نظم کا نقل کرنا طوالت سے خالی نہیں۔ اہلِ بصیرت کے لئے چند شعر کافی ہیں۔

تازیانۂ عبرت

مسرت عارضی ہے عیش کوشی شوقِ بے جا ہے
بہارِ لالہ و گل اے نظر! دھوکا ہی دھوکا ہے

سحر کی دل فریبی چند لمحوں کا تماشا ہے
جہاں کوئی کلی ہنستی ہے میرا دل دھڑکتا ہے

جہاں افروز ہے دن شب کو بے پایاں اندھیرا ہے
ابھی کچھ رنگِ دنیا تھا ابھی کچھ رنگِ دنیا ہے

صبا جس نوشگفتہ پھول کو جھولا جھلاتی ہے
اُسی کے واسطے کچھ دیر میں صرصر کا جھونکا ہے

اُنھیں کی قبر اک اک پھول کو اک روز ترسے گی
مہکتا جن کے عارض پر پڑا شادی کا سہرا ہے

شہاب جنگ سے جلیل القدر امیر کا انجام بھی بڑا عبرت ناک ہے

جیسے ناظرین کسی اور موقعے پر پڑیں گے۔ ہل فورٹ سے آئی ہوئی موٹر باہر کھڑی ہے۔ فانی صحن میں میرے منتظر ہیں ـــ کرنل "آپ اب حاضر ہوتے ہیں" کہہ کر اپنی کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے (یعنی اب رخصت کی اجازت دیجیے)۔ پھر دونوں ہاتھ دونوں جیبوں میں ڈال کر بولے "آبا بابا! کیا ٹھنڈی بج رہی ہے (پناہ بہ خدا کس غضب کی سردی ہے)۔ حسبنا اللہ ونعم الوکیل۔"

"خدا حافظ ـــ خدا حافظ!"

عجلت میں پانوں کی ڈبیاں میز ہی پر رکھی رہ گئیں اور میں بے خیالی میں تیز قدم چل کر موٹر میں بیٹھ گیا۔ سرکار کے ساتھ خاصہ کھانے بیٹھا تو ڈبیا کا خیال آیا۔ لیکن بہ جز خاموشی کوئی چارۂ کار نظر نہ آیا۔ کھانے کے بعد خاصہ کی ایک گلوری سرکار کی عنایتِ خاص سے مرحمت ہوئی۔ مشک یو قوام لگا کر اسے منہ میں رکھا، دل میں رزاقِ مطلق کا شکر ادا کیا۔ دربار شروع ہوا، تو مغنی کی مسحور کن آواز میں ایسا کھویا کہ تا دیر ڈبیا کی طرف سے غافل رہا۔ لیکن تا بہ کے عادت تو یہ تھی کہ ادھر پرنس پیا کی طرف متوجہ ہوئے اور ادھر میں نے اپنی ڈبیا سے گلوری نکال کر منہ میں رکھ لی۔ اس عادت کی بدولت ہاتھ بے خیالی میں جیب کی طرف گئے۔ جیب خالی پاکر میں نے ہاتھ نکالا ہی تھا کہ پرنس اصل حقیقت کو پا گئے۔ اپنی عادت کے موافق بہ آوازِ بلند ارشاد فرمایا "آج کیا بات ہے، میں دیکھتا ہوں کہ صدق جگالی نہیں کر رہے ہیں؟" میں اپنی جگہ کھڑا ہو گیا اور دست بستہ ہو کر عرض کیا "بدقسمتی سے فدوی

پانوں کی ڈبیا جیب میں رکھنا بھول گیا۔" پرنس نے ہنس کر فرمایا "ڈاسی میں بد قسمتی کی کیا بات ہے۔ فانی آج تمہیں اپنی ڈبیا سے پان کھلائیں گے۔" اس ارشاد کو سن کر فانی اپنی جگہ کھڑے ہو گئے اور ہاتھ جوڑ کر عرض کیا "بد قسمتی سے آج فدوی بھی جیب میں ڈبیا رکھنا بھول گیا۔ اس سوءِ اتفاق پر پرنس ہنسنے لگے۔ پھر خدام کو آواز دی اور ایک خدام سے فرمایا "دیکھو ہمارے خاصے کے پانوں سے دو سو گلوریاں ایک تسلے میں رکھ کر بیچ میں خاصے کا قوام ایک شیشی میں لگا کر فوراً لاؤ اور صدق اور فانی کے درمیان رکھ دو تاکہ یہ دونوں جگالی شروع کریں یہ خادم بہت خوب کہہ کر پیچھے ہٹا۔ ہم دونوں نے اس سرفرازی پر سات سات سلام کئے۔ میرا خیال تھا کہ اس حکم کی تعمیل میں کم از کم نصف گھنٹہ تو ضرور صرف ہوگا۔ مگر آپ ہماری حیرت کا اندازہ نہیں فرما سکتے جب اسی خادم نے پانچ منٹ کے اندر چاندی کی ایک ٹرے میں دو سو گلوریاں نہایت سلیقے سے سجا کر ہم دونوں کے سامنے رکھ دیں۔ بیچ میں خوبصورت سی ایک شیشی میں خاصے کا قوام بھی تھا۔ ہم دونوں پھر کھڑے ہو کر آداب بجا لائے۔ لیکن پرنس نے منہ سے یہ نہ فرمایا کہ پان کھاؤ۔ اور بے اجازت خود گلوری کا اٹھا لینا آداب دربار کے خلاف تھا۔

جو اصحاب تمباکو کھانے کے عادی ہیں وہ ہماری بے چینی کا صحیح اندازہ فرما سکیں گے۔ بالکل ویسا ہی معاملہ تھا کہ ایک پیاسے کے سامنے ٹھنڈے پانی کا گلاس رکھا ہوا ضرور ہے، مگر وہ اسے ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ حتیٰ کہ اسی مجبوری اور بے کسی میں رات

سے تین بج گئے، یہ وہ گلوریاں ہمارے سامنے رکھی ہیں مگر ہم لوگ ان کے کھانے پر قادر نہ تھے۔ تین بجے جب ہیں گھر جانے اور آرام کرنے کی اجازت ملی اور پرنس دربار سے خود بھی خواب گاہ تشریف لے گئے تب کہیں ہم دونوں نے دو دو گلوریاں اٹھائیں۔

فانی کہنے لگے، "کیا کہیں ڈبیا ہوتی تو گلوریوں سے بھر کر گھر لے چلتے۔" میں نے کہا کہ ڈبیا ہوتی تو یہ گلوریاں ہی نظر کے سامنے کیوں ہوتیں۔ یہ بخشش ڈبیا نہ لانے ہی کی بدولت ہوئی۔ فانی بے اختیار ہنس پڑے، کہا، سچ کہتے ہو آج ظالم نے ہمارا امتحان لیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ امتحان سخت سے بھی کچھ زیادہ ہی سخت تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم تم دونوں امتحان میں پورے اترے۔ یہ شخص جس کو دنیا پرنس کہتی ہے نہایت ہوش مند اور ذہین ہے۔ دیکھنا یہ چاہتا تھا کہ یہ بڑی لوگ، جن کو ہم نے اپنی مصاحبت کی عزت سے نوازا ہے، دراصل اس عزت کے مستحق ہیں، یا ایسے ویسے ہی ہیں۔" پھر فانی نے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا، (مگر دربار ہال کی چھت کے آگے نہ دیکھ سکے) "خدایا! تیرا شکر ہے کہ تو نے اس امتحانِ صبر میں ہماری آبرو رکھ لی۔" شکرانے کے بقیہ فقرے فانی اس لئے نہ کہہ سکے کہ وہ محبوب رنگیں ادا، جس کے ذمے دربار میں نرت کے کرتب تھے۔ میرے پاس آکر کھڑا ہو گیا میں نے خاصے کی دو گلوریوں سے تواضع کی، جسے اس نے مسکرا کر قبول کیا۔ پھر فرمائش کی، "ذرا اپنا وہ شعر تو پڑھیے" پڑتی ہے نظر بھی۔" مجھے، بے حد پسند ہے۔ میں نے وہ شعر پڑھ دیا:

یہ بات بگڑنے کی نہیں جس پہ خفا ہو   دیتا ہے خدا حسن تو پڑتی ہے نظر بھی

کہنے لگا کیا پیارا شعر ہے۔ اسے میں عمر بھر نہ بھولوں گا۔" فانی کہنے لگے "بھولنا کیسا، یہ تو یاد رکھنے کی بات ہے۔ آپ کو تو ہر وقت یاد رکھنا چاہیئے۔" اس پر خوشش دلی سے ہنسا اور کہنے لگا "سادگی کی حد ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے گویا شعر کہنا کچھ مشکل ہی نہیں۔ جس کا جی چاہے کہہ لے۔" فانی بولے "یہی مشکل ہے اور سخت مشکل ہے۔" اب میں نے اور فانی نے ایک ایک سگریٹ جلایا اور باتیں کرتے ہوئے دربار ہال کے باہر آئے، جہاں ایک قطار سے موٹریں لگی ہوئی تھیں۔ اُسے ہم سے الگ دوسری موٹر پر جانا تھا۔ اس لئے مجھ سے ہاتھ ملا کر خدا حافظ کہا۔ میں نے کہا "افسوس! میں آپ کو خدا کے سپرد بھی نہیں کر سکتا۔" کہنے لگا "وہ کیوں؟" میں نے شعر پڑھا:

یہ رشک بد بلا ہے دمِ رخصتِ حبیب
کیوں کر کہوں، خدا ہے نگہبان، جایئے

فانی بے ساختہ تعریف کرنے لگے کہ کیا برمحل اور باموقع شعر پڑھا ہے۔ وہ کہنے لگا "بے شک شعر اچھا بلکہ بہت اچھا ہے۔" پھر جیب سے نوٹ بک نکال کر شعر نوٹ کر لیا۔

ہل فورٹ سے عابد شاپ پانچ منٹ کا راستہ تھا۔ سرکاری موٹر میری قیام گاہ کے کمپاؤنڈ میں جیسے ہی داخل ہوئی، میرے عزیز کتے جھٹ کر آئے۔ فینی نے جوں ہی میرے پاؤں سے لپٹنا چاہا، میں نے کتے کی طرف دیکھ کر کہا "ٹامی اس کے کان لینا۔" چشم زدن میں فینی کا کان ٹامی کے منہ میں تھا۔ پہلے فینی نے کان چھوڑانے کی کوشش کی۔ جب ٹامی نے کسی طرح کان نہ چھوڑا تو دونوں میں

کشتم کشتا ہونے لگی۔ میں فانی کو خدا حافظ کہہ کے آگے بڑھ گیا۔
یہ تماشا دیکھ کر فانی بے حد خوش ہوئے۔ اور ہفتوں احباب سے اس
کا ذکر کر کے خوش ہوتے رہے۔ ثامی بڑا بہادر کتا تھا۔ بلی کو اس آسانی
سے مار لیتا تھا گویا اس کے مدِ مقابل شیر کی خالہ نہیں، کوئی کمزور چوہا
ہے۔ نوبت بلی کو سرِ میدان للکار کر اس شان سے مارا کہ دیکھنے والے اَش
اَش کرنے لگے۔ افسوس کہ یہی اُس مرنے والے کا آخری شکار تھا، کیونکہ
اس کامرانی اور فتح یابی کے تیسرے ہی مہینے وہ بہادر خود بھی صرف
تین روز کے بخار میں مجھے داغ مفارقت دے گیا۔
جانوروں کے صدر اسپتال کے انچارج ڈاکٹر نے متعدد انجکشن
لگائے لیکن وہ نامراد تپ کسی تدبیر نہ اُتری۔ تیسرے دن سہ پہر کو ڈاکٹر
نے آکر دیکھا تو مایوسی ظاہر کی اور اُسی رات نصف شب کے بعد ثامی کی
روح قیدِ حیات اور بندِ غم شکار دونوں سے آزاد ہو گئی۔ دس بجے
دن کو پولو گراؤنڈ کے متصل، نیم کے سائے میں اُسے سپردِ خاک کیا گیا،
جہاں وہ محوِ خواب ہے۔ سچ ہے اس دارِ بے ثبات میں کسی کو ثبات
نہیں۔ فردوسی کا رستم ہو یا ہمارا سہراب جنگ ثامی، انجام دونوں کا
ایک ہے۔ اب اس خاک پر سبزہ لہلہاتا ہے اور ملہمِ غیب
مجھے اکثر یہ شعر سناتا ہے:

رہے سبزہ ہرا جس نے لحد کی آبرو رکھ لی
سنا تھا بے کسی میں کام بیگانہ نہیں آتا

اس پیکرِ وفا کی دائمی جُدائی سے مجھے وہ صدمۂ عظیم پہنچا کہ تین دن
دربارِ دربار سے غیر حاضر رہا۔ فانی دنجم صبح و شام مجھے آ آ کر تسلی

اور تسکین دیتے رہے۔
شامی رفاقت اور وفا کا حق ادا کر گیا۔ احسان مندی اور شکر گزاری کا حق مجھے ادا کرنا ہے۔

جوش کی ہمدردی

جوش نے ان لمحاتِ غم میں میرے ساتھ بڑی ہمدردی کی اور دہلی سے تار پر مجھے حسبِ ذیل پیامِ تعزیت بھیجا:

Read in daily "PAYAM" death of Mr. Tommy Science Condolence. I Share your sorrow in this bereave mont, as deceased was also my intimate friend.

Sogwar
Joshe.

کسی درگاہ کے ایک نیم مُلّا خطرۂ ایمان نے جو شاید نانڈیڑ یا پربھنی کے کسی مڈل اسکول میں اخلاقیات کا معلم تھا، کتّے کے ساتھ اس تعلقِ خاطر پر مجھے ایک خط لکھ مارا۔ جو ہذیانات اور بکواس کی پوٹ

تھا۔ میں نے اس مردِ لعلول کو صرف یہ شعر لکھ بھیجا:

اے نفسِ خبیث آدمی بن
گھٹتے میں دلی کی خصلتیں ہیں

جوشؔ کو میں نے تار ہی پر اس ہمدردی کا شکریہ ادا کر کے یہ شعر لکھ بھیجا:

بہت آتی ہے یاد اے جوشؔ تیری
خدا خوش رکھے تجھ کو تو جہاں ہے

ثاؔمی کی عادت تھی کہ جس وقت میں دوستوں کے ساتھ ڈرائینگ روم میں بیٹھتا تھا اس وقت وہ اپنی کرسی پر جو ڈرائینگ روم میں ان کے لئے مخصوص تھی ضرور بیٹھتے تھے، اور کُشن کے سہارے ایسے رئیسانہ انداز سے بیٹھتے تھے کہ میرے احباب مسکرانے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ اب ملاقات کے کمرے میں اُن کی جگہ خالی دیکھ کر کلیجا منہ کو آتا تھا، پلکیں اس صدمے سے ہر وقت نم رہتی تھیں، دل بے اختیار اُمڈا آتا تھا۔ آخر اس بے تابی و بے قراری میں ایک دن خونِ دل صفحۂ کاغذ پر ٹپکنے لگا۔ شاید دس گیارہ شعر کی نظم لکھی تھی۔ حافظے پر زور دینے سے تین ہی شعر اس وقت یاد آئے ہیں، وہی ہدیۂ ناظرین ہیں۔

اکڑ نہ اے سر خوشِ جوانی، نتیجہ اچھا نہیں خوشی کا
کہ باعثِ انتشارِ دل ہے، چمن میں ہنسنا فقط کلی کا

غرور کس زندگی پہ اتنا، نگاہِ عبرت سے دیکھ غافل!
ہے ساتھ روزِ ازل سے کیا جہاں میں ہستی و نیستی کا

نفس ہے کیا، اک ہوا کا جھونکا، اسی پہ موقوفِ زندگانی
سمجھ اِسے اپنا دشمنِ جاں، بھروسہ کیا دم کی دوستی کا

تیسرے شعر پر فانی تادیر وجد میں رہے۔ مگر مولوی سید احمد صاحب ندوی بہت بگڑے کہ ایک کتے کی موت پر ایسے مضامینِ عالیہ نظم کرتے ہو۔ جس کا وہ ہرگز مستحق نہ تھا۔ میں نے ان کی طرف دیکھ کر صرف یہ مصرع پڑھا:

افسوس تمھیں قدر نہیں اہلِ وفا کی

فانی اس برجستگی پر لوٹ گئے اور مولوی صاحب موصوف بے اختیار ہنس دیئے۔ فرمایا "خدا تم شاعروں سے بچائے تم سے جیتنا بہت مشکل ہے۔"

فانی کے اصرار پر چوتھے روز پرنس کے دربار میں حاضر ہوا۔ دریافت فرمایا "تین دن سے کہاں غائب تھے؟" اُن سے طبیعت کی ناسازی کا بہانہ کیا۔

آج لپسٹی سوپ کے بعد پیش خدمت نے پہلی ڈش ماش کی کھچڑی کی پرنس کے سامنے پیش کی جسے انھوں نے بہ رغبت لیا۔ اور کئی چمچے اپنی پلیٹ میں نکال کے خدمت گار کو حکم دیا صدق کے سامنے لے جاؤ۔ خدمت گار میرے سامنے لایا۔ میں نے اس عنایتِ خاص پر اٹھ کر پرنس کو سات سلام کیا۔ پھر اپنی جگہ بیٹھ کر اس خیال سے ایک ہی چمچہ لیا کہ پیٹ میں پلاؤ کھانے کی گنجائش باقی رہے۔ میں لے چکا تو پرنس نے فرمایا "فانی کو بھی دکھاؤ۔" فانی نے بھی میری ہی طرح کھچڑی کو جنسِ حقیر جان کر ایک ہی چمچہ نکالا۔ نوالہ منہ میں رکھتا ہوں تو وہ لذّت پائی جو عمر بھر کسی پلاؤ یا بریانی میں نہ پائی تھی۔ اب تو خواہش ہوئی اور مل جائے تو آج کھچڑی کے سوا کسی اور چیز کو ہاتھ نہ لگاؤں۔ مگر یہ حسرت دل ہی میں گھٹ کر رہ گئی۔ فانی بھی اپنی اس روز کی نادانی پر کئی برس

افسوس کرتے رہے۔ مگر وہ کھچڑی پھر کبھی کھانے کو نہ ملی۔ جنت میں فانی کو میسر آئی ہو تو مجھے خبر نہیں، دنیا میں تو اب ایسی نعمت کا ملنا محال معلوم ہوتا ہے۔ کھوج لگانے پر معلوم ہوا کہ بادام مقشر کے چاول اس خوبی اور صفائی سے تراشے تھے کہ اصل چاول اور ان مصنوعی چاولوں میں بال برابر کا فرق نہ معلوم ہوتا تھا۔ اسی طرح پستے کو تراش کر ماش کی دال سے ملا دیا تھا۔ دم دیتے وقت اصلی چاول اور دال کے ساتھ ایک حصہ ان نقلی دال اور چاول کا بھی شریک کر دیا تھا۔ خدا جانے گھی برابر کا کھپایا تھا یا دُگنا۔ ہر پلاؤ اب اس کھچڑی کے آگے ہیچ معلوم ہوتا ہے۔

پرنس کی عادت تھی کہ خاصے کے بعد صرف انجیر تناول فرماتے تھے۔ کسی اور میوے کی طرف رغبت فرماتے میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ وہ سب محض میز کی زینت کے لئے رکھے جاتے تھے جو ڈنر کے بعد خدّام کے کام آتے ہوں گے۔ ایک ایک انجیر ازراہِ عنایت پرنس میری اور فانی کی طرف بھی نام لے کر پھینک دیا کرتے تھے۔ یوں ہی الک جنگ، ڈھلک جنگ، پیا اور کیر لو بھی اُس لطف خاص سے بہرہ یاب ہوتے تھے۔

آج ٹیبل پر کمّو میاں کو شیطان نے اُنگلی جو دکھائی، قبل اس کے کہ پرنس انجیر کی پلیٹ کی طرف متوجہ ہوں، انھوں نے اٹھ کر خود ہاتھ بڑھائے اور پرنس کے آگے سے دو انجیر اٹھا لئے۔ یہ بہت بڑی گستاخی تھی۔ پرنس بد دماغ ہو گئے۔ ایک خدمت گار کو حکم دیا کہ انجیر کی پلیٹ کمّو کے سامنے رکھ دو۔ کمّو اس برہمی کو سرفرازی جان کر

دونوں ہاتھوں سے سلام کرنے لگے۔ پرنس میری طرف دیکھ کر ہنسنے لگے۔ میں بھی ہنس پڑا۔

آصف جاہی سلاطین اور شاہزادوں کے دربار کا آئین تھا کہ اگر بادشاہ کی کسی چیز کو دوسرا شخص ہاتھ لگا دے تو وہ چیز بادشاہ اُسی کو بخش دیتے تھے۔ پھر اُسے اپنے مصرف میں نہ لاتے تھے۔

آصف سادس نواب میر محبوب علی خاں خلد آشیاں کی خواب گاہ میں ایک فراش صبح کے وقت کمرے کی صفائی میں مصروف تھا۔ سرکارِ مرحوم کی مسہری کے قریب پہنچا تو اُسے گول میز پر ایک خوشنما اور بہت چمکیلی شے رکھی ہوئی نظر آئی۔ فراش اُسے ہاتھ میں لے کر حیرت سے دیکھنے لگا۔ اتفاقِ وقت اُسی وقت سرکار بھی کسی ضرورت سے خواب گاہ میں تشریف لے آئے۔ سرکار کو دیکھ کر فراش کانپنے لگا۔ چاہتا تھا کہ وہ چیز پھر اسی میز پر رکھ دے۔ لیکن سرکار نے جن کی داد و دہش کے سامنے حاتم کی داد و دہش بھی ہیچ تھی، بہ شفقت فرمایا کہ تو لے لے ہم نے تجھے بخش دیا۔ فراش کی جان میں جان آئی۔ جھک کر آداب بجالایا، اور اپنے کم قیمت کوٹ کی جیب میں وہ بیش قیمت سگریٹ ہولڈر ڈال کر اُس کمرے سے رخصت ہو گیا۔

دوسرے دن سے ادنیٰ درجے کے سگریٹ اُس ہیرے کے سگریٹ ہولڈر میں لگا کر پینے لگا۔ کچھ عرصے کے بعد سرکار بمبئی تشریف لے گئے، اسٹاف اور شاگرد پیشہ کے ہمراہ وہ فراش بھی گیا۔ وہاں تاج محل ہوٹل میں سرکار مرحوم کا دو ہفتے قیام رہا۔ اس عرصے میں ہوٹل کے

ایک بیرے سے فراش کا دوستانہ ہوگیا۔ فراش حیدرآباد کا سیدھا سادھا مسلمان تھا، جسے آج تک یہ خبر نہ تھی کہ سرکار کی اُس بخشش کے بعد اب وہ ادنٰے درجے کا فراش نہیں رہا، بلکہ چاہے تو خود بھی امیروں کی طرح پوری زندگی بسر کر سکتا ہے۔

بیرا بمبئی کا باشندہ اور چلتا پُرزہ انسان تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ میرا بے وقوف دوست اپنے سگریٹ ہولڈر کی قدر و قیمت سے لاعلم ہے روز فراش کی خاطر مدارات کرتا اور اُس سے بہت تپاک سے ملتا۔ جس روز فراش کو حیدرآباد واپس آنا تھا اُس دن بیرے نے اُسے لذیذ کیک اور نفیس پیسٹریاں کھلائیں، عمدہ سے عمدہ کولڈ ڈرنکس پلائے۔ اس تواضع کے بعد حرفِ مطلب زبان پر لایا" یار اب نہ جانے تم سے کب ملاقات ہوگی اگر مضائقہ نہ سمجھو تو اپنا سگریٹ ہولڈر مجھے دیتے جاؤ۔ میرے پاس تمہاری مستقل یادگار رہے گی۔ جس وقت میں اس میں سگریٹ لگا کر پیوں گا، تم کو یاد کروں گا۔" سادہ لوح اور بدنصیب فراش، اپنے عیّار دوست کے بچھائے ہوئے جال میں پھنس گیا۔ اور بہ خوشی وہ سگریٹ ہولڈر اس کے حوالے کر کے شاہی اثاث کے ساتھ حیدرآباد چلا آیا۔

بیرا اپنی پہلی فرصت میں اس سگریٹ ہولڈر کو ایک جوہری کے پاس لے گیا۔ جوہری نے اس ہیرے اور بیرے کو بہ نگاہِ حیرت دیکھا اور پہلی ہی نظر میں ڈیڑھ لاکھ قیمت لگائی۔ مگر یہ سوچ کر کے یہ چوری کا مال ہے، ایسا نہ ہو کہ مفت میں کسی مصیبت میں خود پھنس جاؤں۔ اُس نے بیرے کو سگریٹ ہولڈر سمیت حوالۂ پولیس کر دیا۔ بمبئی کی پولیس

تین دن کے اندر اس نتیجے پر پہنچ گئی کہ ہو نہ ہو یہ بیش قیمت ہیرا حضورِ نظام کا ہے۔ ہیرے کا اظہار قلم بند کر کے اسے توحوالات میں رکھا اور خود ایک افسرِ پولیس اُسے لے کر حیدر آباد حاضر ہوا۔

کوتوالِ شہر نے وہ ہیرا سرکارِ مرحوم کے سامنے پیش کیا۔ واقعات سُنائے اور عرض کیا کہ سرقے کی علّت میں تاج محل ہوٹل کا ایک بیرا ماخوذ ہوا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ حضور نظام کے فراش نے اسے چلتے وقت دوستانے میں دیا ہے۔

سرکارِ مرحوم کو یاد آ گیا کہ خود انھوں نے اپنا سگریٹ ہولڈر فلاں فراش کو عطا کیا تھا۔ فراش طلب کیا گیا۔ اس نے اقرار کیا کہ میں نے بمبئی سے روانگی کے دن بہ خوشی اس بیرے کو دیا تھا۔

سرکار نے کوتوال کو حکم دیا کہ تم بمبئی کی پولیس کو اطلاع دے دو کہ سگریٹ ہولڈر بے شک ہمارا ہے مگر ہم نے اُسے اپنے ایک فراش کو دیا تھا۔ اُس نے اپنی خوشی سے اُس بیرے کو دیا ہے۔ لہٰذا اب سگریٹ ہولڈر اُسی بیرے کا ہے۔ اُس نے چوری نہیں کی۔ بیرا فوراً رہا کر دیا جائے اور سگریٹ ہولڈر اس کو دے دیا جائے۔ قسمت کے کھیل دیکھئے کہ فراش عمر بھر فراش ہی رہا۔ اور اس کی بدولت ایک ادنٰے بیر المحوں میں دولت مند بن گیا۔

ڈنر کے بعد دربار ہال میں نشست ہوئی نواب قدرت نواز جنگ نے اپنے پاندان سے ایک گلوری بنا کر اور استادہ ہو کر پہلے پرنس کی خدمت میں پیش کی، پھر خود کھائی۔ پرنس اس وقت مجھ سے کچھ ارشاد فرما رہے تھے۔ یکایک کیا دیکھتا ہوں کہ نواب صاحب

موصوف نے اپنی جگہ سے اٹھ کر پیاؔ کے کان میں کچھ کہا۔ پیاؔ اثبات میں سر ہلاتے رہے۔ اس کے بعد نواب موصوف فانی کے پاس آئے فانی کھڑے ہوگئے۔ ان سے بھی سرگوشی ہوئی۔ میں نے خیال کیا کہ دربار سے متعلق کوئی خاص بات ہوگی۔ اس کا تو گمان بھی نہیں گزرا کہ خود میرے ہی خلاف کوئی سازش ہو رہی ہے۔

فانی سے سرگوشی فرماکر نواب ممدوح پرنس کے دائیں طرف جا کر کھڑے ہوئے۔ پرنس نے نظر اٹھائی تو دست بستہ ہوکر عرض کیا "سرکار! فدوی صدقؔ صاحب کی ایک نظم کا کمال مشتاق ہے۔ سرکار حکم دے دیں تو مدتوں کا اشتیاق آج پورا ہو جائے۔"
پرنس نے ابھی میری طرف نظر ہی ڈالی تھی، زبان سے کچھ ارشاد نہ فرمایا تھا کہ پیاؔ اور فانیؔ اپنی جگہ ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوگئے۔

پیاؔ: "سرکار خانہ زاد بھی اس نظم کا کمال مشتاق ہے۔"

فانیؔ: "غلام کی بھی یہی خواہش ہے کہ وہ نظم صدقؔ صاحب سے پڑھوائی جائے۔ پورا شہر اس کی شہرت سے گونج رہا ہے۔ انھوں نے مجھے سنانے میں آج تک بخل سے کام لیا ہے۔"

پرنس: "آخر وہ نظم ہے کیا؟ کچھ اس کی حقیقت تو بتاؤ، تو میں صدقؔ کو پڑھنے کا حکم دوں۔"

فانیؔ: "سرکار دراصل وہ ایک دہلوی پروفیسر کی ہجو ہے۔"

پرنس: "(چونک کر) صدقؔ ہجو بھی لکھتے ہیں۔"

فانیؔ: "سرکار! ایسی بے مثل ہجو کہتے ہیں کہ غلام کے نزدیک اس صنفِ خاص میں ان کا کوئی شریک و سہیم ہی نہیں۔

حیدرآباد کا شاید ہی کوئی امیر ایسا ہو جس نے دعوت کر کے ان سے وہ ہجو نہ سُنی ہو۔"

پرنس: "تو پہلے مجھے ان کی دعوت کرنے کا موقع تو دو۔ جب وہ نظم یہ دعوت ہی میں پڑھتے ہیں، تو میں قانون شکنی کا کیوں مرتکب ہوں۔"

میں: "(استادہ ہو کر اور ہاتھ باندھ کر) "میں تو خوش قسمتی سے روز ہی سرکار کے یہاں دعوتیں کھایا کرتا ہوں۔ سرکار کو کسی اہتمام و انتظام کی کیا ضرورت ہے۔"

پرنس: "تم جو روزانہ میرے ساتھ کھاتے ہو وہ تو ماحضر ہوتا ہے۔"

میں: "ایسے ماحضر پر تو یہاں کا ہر امیر اپنی دعوت کو قربان کرنے پر تیار ہو جائے۔"

پرنس: (خوش دلی سے ہنسنے لگے۔ پھر فرمایا) "فانی! آخر اُس ہجو کا کوئی بیاک گراؤنڈ ضرور ہوگا۔ صدق کو ہجو لکھنے کی کیا ضرورت پیش آئی۔ پہلے سببِ تالیف مجھے مختصراً بتاؤ تاکہ میں نظم کا پورا لطف اٹھا سکوں۔"

فانی: "سرکار! انھوں نے غالب کے ایک شعر کا مطلب اُن سے بیان کیا تھا، وہی مطلب بنائے مخاصمت ہو گیا۔"

پرنس: "صدق تمھیں بتاؤ، قصہ کیا تھا۔ تم ہجو لکھنے پر کیوں مجبور ہوئے۔"

میں: "سرکار! واقعہ یہ ہے کہ وہ نہایت ہی بر خود غلط شخص ہے۔ اپنے زعمِ ناقص میں مولوی عبدالحق صاحب کو طفلِ مکتب

جانتا ہے۔ طبا طبائی اور اُستاد جلیل کا تبحر کے ساتھ ذکر کرتا ہے۔
ایک دن مجھ سے کہنے لگا "غالب کو دراصل اُن کے شاگرد حالی نے زمانے
سے روشناس کر دیا۔ وہ یادگارِ غالب نہ لکھتے تو آج کوئی غالب کا نام
بھی نہ جانتا۔ پھر بھی اُن کے دیوان میں اکثر اشعار ایسے ہیں جن کو حالی
خود نہیں سمجھے۔ ان اشعار میں غالب نے ایسے ایسے حقائق پیش
کئے ہیں، جن کی ہوا بھی عبد الحق، طبا طبائی یا جلیل کو لگ جائے تو
زمین پر پاؤں نہ رکھیں۔ میں نے کہا کوئی شعر ارشاد ہو۔ کہنے لگا،
اسی شعر کو لے لیجئے:

کرتے ہو مجھ کو منع قدم بوس کیلئے
کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں

اس شعر کا صحیح مفہوم اگر عبد الحق، طبا طبائی یا جلیل بتا دیں تو میں
خطِ غلامی لکھ دوں۔ ڈاڑھی بڑھا کر جاہلوں میں رنگ جما لینا
یا جھوٹا پروپیگنڈہ کرکے شہرت حاصل کر لینا اور چیز ہے اور
ٹھوس علم رکھنا اور چیز ہے"

پرنس: "ڈاڑھی بڑھانے کا اشارہ کس کی طرف ہے؟"
میں: "مولوی عبد الحق صاحب کی طرف"
پرنس: "آگے چلو"

میں نے کہا "پھر آپ ہی ازراہِ کرم ان حقائق پر روشنی ڈالئے
جو اس شعر میں پنہاں ہیں اور جنھیں دنیا نہیں سمجھتی۔ کہنے لگا غور سے
سنئے اور مجھ سے وعدہ کیجئے کہ میرا بتایا ہوا مطلب عبد الحق، طبا طبائی
یا جلیل کے سامنے کبھی بیان نہ کیجئے گا۔ ورنہ وہ لوگ اسے اُڑا لیں گے

اور اپنا لیں گے۔ میں نے وعدہ کیا اور اس نے غالب کے اچھے خاصے شعر کی مٹی اس طرح پلید کی۔

"ایک رنڈی جس سے غالب کا تعلق تھا، اس کے پاس "آسمان" نام کا ایک چھوکرا ملازم تھا۔ شاعر نے اس لونڈے کے نام سے فائدہ اٹھایا ہے اور مضمون پیدا کیا ہے۔ کہتا ہے کہ وہ لونڈا تو ہر رات تمہارے پاؤں دباتا ہے اور مجھے جو تمہارا عاشق ہوں، تم قدم بوسی سے منع کرتے ہو۔ کیا میں رتبے میں اس لونڈے (آسمان) کے برابر بھی نہیں؛ یہ عجیب و غریب مطلب بیان کر کے اس نے مجھ پر فاتحانہ نظریں ڈالیں۔ اور کہا کہ غالب کے دیوان میں ایسے بیسیوں اشعار ہیں، جنھیں میں عبد الحق، طباطبائی، اور جلیل کو بھی اسی طرح سمجھا سکتا ہوں، جس طرح کلاس میں کالج کے طالب علم کو سمجھاتا ہوں۔"

پرنس: (بے اختیار ہنستے ہوئے) "اس مطلب کو سن کر تم پر کیا گزری؟"

میں: مجھے اُس بدبخت اور بدمذاق کی صورت سے نفرت ہو گئی۔

پرنس: بس اب تم وہ ہجو پڑھو۔ میں اب انھیں، لوگوں کی طرح مشتاق ہوں۔"

میں نظم پڑھنے لگا:۔

بھاڑ ایک زمانے تک دلّی میں اگر جھونکا
اس سے کہیں اُردو کا جلوا نظر آتا ہے
میرٹھ کا لب و لہجہ چھپتا ہے چھپائے کب
ہر لفظ ہر اک فقرہ بھونڈا نظر آتا ہے

دعوائے زباں دانی پھبتا نہیں اُس منہ پر
انشا میں غلط جس کا املا نظر آتا ہے

خلوت ہو کہ جلوت ہو وحدت ہو کہ کثرت ہو
سفلے کو جہاں دیکھو سفلا نظر آتا ہے

پلّے تو نہیں رانی، اظہار ہے پر ہیبت کا
کم ظرف طبیعت کا اوچھا نظر آتا ہے

مقصود ریاکاری ہر بات میں رہتی ہے
کم بخت تصنع کا پُتلا نظر آتا ہے

حلقے میں مشائخ کے بابا تو ہیں ہو حق میں
مسند پہ سیادت کی بیٹا نظر آتا ہے

تہذیبِ نشست اُسکی موٹر پہ کوئی دیکھے
انگریز بہادر کا کُتّا نظر آتا ہے

از بس کہ ہے آبائی یہ وحشتِ یکتائی
شوفر کی جگہ لوفر تنہا نظر آتا ہے

نوّاب کی نظروں میں عالِم ہو کہ علّامہ
یاروں کو تو اُلّو کا پٹّھا نظر آتا ہے

حمّام کے اندر ہے برزخ کا جدا عالم
بھیگی تو نہیں بھیگا بلّا نظر آتا ہے

اس عشقِ مجازی نے کھویا جو بھرم سارا
اب حسنِ حقیقی کا جویا نظر آتا ہے

یہ حُسن کی عُریانی رکھتی ہے یہی معنی
معشوق بھی کپڑے کو ننگا نظر آتا ہے

(قطعہ) لمبی سی کل اِک ٹوپی سرپوش تھی منڈیا پر
اب ہیٹ کا چندیا پر جھابا نظر آتا ہے
ایّام جہالت میں تھا مولوی گُل خیرو
فیشن زدہ اب مسٹر جِیڈا نظر آتا ہے

ماما سے ٹھٹھائے منہ بیٹھا ہے جو چوکی پر
پھولا ہوا طاعونی چوہا نظر آتا ہے

مے نوش نے سستی سی پی لی ہے جو تلچھٹ
خشتِ خم صہبا پر اوندھا نظر آتا ہے

لیٹا ہوا کمل میں لپٹا ہوا چوکی پر
کنگال کا لاوارث مُردا نظر آتا ہے

علّامۂ[1] ہاپڑ تو سیدھے سے اک انساں ہیں
کیوں ان سے وہ کج دانش ٹیڑھا نظر آتا ہے

(قطعہ) اُس توسنِ بینی پر عینک کا نہیں آسن
بیٹھا رُخ کر دم پر ٹڈا نظر آتا ہے
چہرے کی وہ آرائش، بینش کی یہ افزائش
ابجد کا الف اس کو بھالا نظر آتا ہے

---

[1] علّامۂ ہاپڑ۔ بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب ہاپڑ ان کا وطن ہے۔

جو کہتے ہیں علامہؔ[1] سُنتی نہیں قطامہ
کتنی کو وہ بھڑوا خود کشتا نظر آتا ہے

عفریتِ[2] نما دھڑ پر منکا سا ہے سر جس کا
اس گرگ کا یہ سگ بھی گرگا نظر آتا ہے

ایک آنے میں اک بوسہ لیتے ہیں مالن کا
سیبِ ذقن ان داموں سستا نظر آتا ہے

سرمار[3] کے دو چوزے مرغی تو ہوئی چمپت
اب ڈربے میں ٹٹرول لٹوں مرغا نظر آتا ہے

ہوتے ہیں بڑے بھائی جب وا اک میں ساتھ اسکے
بندر کی معیّت میں بکرا نظر آتا ہے

(قطعہ) پون انچ کے علامہ نکلے ہیں گشتی کرنے
اک فتنہ سا کوچے میں برپا نظر آتا ہے
مانندِ سگِ تازی ہم راہ ہے لمبو بھی
مانوس بڑی دُبے سے ہمزا نظر آتا ہے

(قطعہ) ہتیائے نہیں بیٹھے دلیوال کو وہ غالب کے
بونیئے کے جنگل میں ہیرا نظر آتا ہے

---

[1] خود پروفیسر موصوف۔
[2] پرنسپل کالج جو دیو پیکر اور دیو سیرت آدمی تھا۔
[3] موصوف کی بیوی دو بچّوں کو چھوڑ کر مری تھیں۔

لنگور نے پکڑا ہے انگور کے خوشے کو
قالبِ دُرِ غلطاں پر گھونگھا نظر آتا ہے
معشوق کی آنکھوں کا بھینگا ہے تماشائی
سودہ زدہ گیسو کا گنجا نظر آتا ہے
ہاتھ آئی ہے ترکے میں فطرت جو حقیقت میں
ہر بیر کا پیڑ اُن کو سدر نظر آتا ہے
شاعر کا ہے مطلب کچھ سمجھے ہیں وہ کچھ معنی
اب شعر ہے کیا گورکھ دھندا نظر آتا ہے
کیا ذہن کی جودت ہے وصفِ یدِ بیضا پر
ان کو کفِ موسیٰ میں انڈا نظر آتا ہے
یہ گنبدِ دوں[1] پیر یہ چرخِ ستم گستر
بڑھیا کا انھیں اپنی چرخا نظر آتا ہے
اس فہم و فراست پر ہر چند اُڑیں ٹھٹھے
ان کو تو کسٹرا منہ خود سوندھا نظر آتا ہے
کہتے ہیں کہ کہیے کیا پامال ہے مضموں سب
آنگن پئے رقص اُن کو ٹیڑھا نظر آتا ہے
(آخری قطعہ) ہم راہ جہاں دیکھو جورو بھی ہے سالی بھی
تثلیث کا حامی کب تنہا نظر آتا ہے

---

[1] وہی چھوکرا جس کا نام آسمان تھا۔

اُن چاند کے ٹکڑوں میں دھبا سا جو دِ اسکا
اُن پریوں کی نسبت سے سایا نظر آتا ہے
اِس طرفہ مثلث کی ڈھونڈھی ہیں وہ تشبیہیں
مصری کی ڈلی جس سے سقرا[1] نظر آتا ہے
اِک غیرتِ فجری ہے اِک رشکِ سِہری ہے
خود بیچ میں دونوں کے لنگڑا[2] نظر آتا ہے

کامل دو گھنٹے میں یہ ہجو ختم ہوئی کیونکہ ایک ایک شعر کبھی شعر مکرّر اور کبھی سکرر پڑھنا پڑتا ہے۔ پرنس نے فانی سے ارشاد فرمایا "فانی کمال کر دیا صدق نے۔ غریب کی مٹی پلید کر کے رکھ دی"

فانی: "فدوی کو پوری نظم سننے کا آج ہی موقع ملا ہے۔ یوں جستہ جستہ شعر اس کے مختلف احباب سے سُنے تھے۔ پوری ہجو میں غضب کی روانی اور شگفتگی ہے اور پھر فحاشی سے بالکل پاک ہے۔ علما کو بٹھا کر ان کے سامنے پڑھوا لیجیے"

پیا: "خانہ زاد پوری نظم میں بندش کی چستی پر غور کر رہا تھا کیا مجال ہے کہ اتنی طویل نظم میں ایک مصرع تو سست ہو"

کیر لیو: "سرکار کی بدولت ایسا کلام میرے سننے میں بھی آگیا ورنہ میں کہاں سن پاتا"

پرنس: "صدق تم نے اُستاد جلیل کو بھی یہ نظم سُنائی تھی؟

---

[1] اہلِ فن سے معذرت کے ساتھ۔
[2] پروفیسر موصوف ایک حادثے سے لنگ کرنے لگے تھے۔

انھوں نے سُن کر کیا کہا ؟"

میں : " ایک ایک شعر کی تعریف کی اور آخر میں فرمایا بہ خدا آپ اس فن کے امام ہیں۔"

پرنس : " اچھا عبدالحق نے بھی سُنی ؟ "

فانی : " وہ سیکڑوں مرتبہ سُن چکے اور ان کی تو بڑی قدر کرتے ہیں ۔"

پرنس : " اور کرنی چاہیئے اس لئے کہ میری رائے میں اس ہجو سے اُردو ادب میں ایک بیش بہا اضافہ ہوا ہے ۔"

پپّا : " بہت صحیح ارشاد ہوا صاحب! غلام بھی یہی عرض کرنا چاہتا تھا۔ سرکار نے خانہ زاد کے منہ سے بات چھین لی ۔"

ناظرین مجھے اس طویل نظم کے لئے معاف فرمائیں۔ چونکہ دربار میں یہ نظم اسی طرح پڑھی گئی تھی جیسا میں اوپر لکھ چکا ہوں، اس لئے میں واقعہ نگاری پر مجبور تھا۔

فانی دربار کے غیر معمولی واقعات کو حادثہ کہا کرتے تھے۔ یہ ان کی اپنی اصطلاح تھی۔ اس لئے انھیں کی اصطلاح میں اس ہفتے میں متواتر دو حادثے پیش آئے۔

(۱) وہ محبوبِ خوش ادا جس کے ذمے نرت کے کرتب تھے، نہ جانے کس بات پر معتوب ہو گیا۔ فانی بڑے ٹوہی تھے انھوں نے بہت کھوج لگایا، مگر کسی طرح اس کا پتہ نہ چلا سکے کہ کس قصور پر معتوب ہوا۔

(۲) مُعز، جن کے منہ پر چار چار اُنگل کی ڈاڑھی تھی، اور بھلی

معلوم ہوتی تھی، یکایک، کرزن فیشن میں دکھائی دیئے۔ نئے فیشن میں کچھ مضحکہ خیز صورت رہی، پھر رفتہ رفتہ ہماری نظریں دیکھنے کی عادی ہوگئیں۔

فانی نے مجھے چہل قدمی کرتے وقت بتایا کہ سرکار کے حکم سے زبردستی ان کی ڈاڑھی مونڈ دی گئی۔ اُن کو ڈاڑھی ناپسند تھی۔ کئی بار حکم دے چکے تھے کہ اس دھوکے کی ٹٹی کو کم کرو۔ مگر معز لئے نورِ الٰہی جان کر چھاتی سے لگائے پھرتے تھے۔ ایک رات کو جب تم اتفاق سے غیر حاضر تھے۔ آٹھ خدمت گاروں نے انھیں جکڑ لیا اور حجام نے جو پہلے سے تیار تھا، اس پلی ہوئی ڈاڑھی پر اُسترا پھیر دیا۔ چاہے یوں سمجھو کہ قدامت کی گردن پر چھری پھیر دی۔

میں: "پھر سرکار نے اس مقتول ڈاڑھی کا خوں بہا کیا عطا فرمایا؟"

فانی: "کچھ بھی نہیں۔"

میں: "یہاں سرکار سے چوک ہوئی، انھیں لازم تھا کہ از دو ہزار روپے معز کو دلوا دیتے اور کہہ دیتے کہ یہ روپیہ تمہاری مرحوم ڈاڑھی کا خوں بہا ہے۔ ایک ذرا سی سخاوت سے معز اپنا غم بھول جاتے۔"

فانی: "بجا ہے اس سخاوت کو دیکھ کر تم بھی ڈاڑھی چھوڑ دیتے، اور پرسوں ماہر القادری تو سرکار ڈاڑھیوں کے جنجال میں پھنس کر رہ جاتے۔"

میں: "تو ان کے لئے کیا یہ بڑی بات ہوتی۔ زرا غور فرمائیے کہ کس حاتمِ دوراں کے پوتے ہیں۔"

فانی: (اِدھر اُدھر دیکھ کر رازدارانہ لہجے میں) "تم بہت دور دیکھنے کے عادی ہو۔ پہلے قریب کی چیز دیکھا کرو، یہ نہ ہو، دیکھتے کہ کس

باپ کے بیٹے ہیں "۔ یہ کہہ کر قاآنی خوب ہنسے۔

میں "جس باپ کے بیٹے ہیں وہ خود بھی اُسی حاتم دوراں کا فرزند ہے۔ فرق دونوں میں صرف اس قدر ہے کہ سرکار مرحوم لکھ لٹ تھے، اور ہمارے سرکار داد ودہش کے وقت بھی انجام پر نظر رکھتے ہیں۔ دولت کو اس طرح نہیں لٹاتے کہ خزانہ ہی خالی ہو جائے، اور خلد آشیانی کی طرح ہر سال دیوانی سے قرض لینا پڑے۔ بات یہیں تک پہنچی تھی کہ ایک خوش جمال پیش خدمت دوڑتا ہوا آیا اور ہم دونوں سے کہنے لگا' جلد چلیے سرکار برآمد ہو چکے ہیں۔ ہم لوگ تیز قدم چل کر دربار ہال میں پہنچے۔

اختری بائی (فیض آباد والی) جو دو ہفتے سے ایک ہزار روپیہ روزانہ پر آئی ہوئی اور پرنس کی مہمان تھی' آج اس کے قیام کا آخری دن تھا' اور آج کی رات اس کا آخری مجرا تھا۔

ناظرین متعجب ہوں گے کہ ایسی نامور مغنیہ کی آمد ایسی خاموشی سے عمل میں آئی کہ ہمیں اُس کے آنے کی اطلاع آج ہو رہی ہے جو اُس کے جانے اور دربار سے رخصت ہونے کی رات ہے۔ وجہ اس خاموشی کی یہ ہے کہ اختری کو حسنِ صورت سے قدرت نے بہت کم حصہ عطا کیا تھا' گلا اس نے بے شک نور کا پایا تھا۔ مگر دھوم دھام تو صاحبانِ جمال ہی کی آمد آمد پر اچھی معلوم ہوتی ہے' کسی معمولی شکل و صورت کی مغنیہ کا تعارف میں نے اپنے ناظرین سے مناسب نہ جانا۔

دو بجے رات کو پرنس نے اُس سے ٹھمری کی فرمائش کی' ہنوز وہ ساز سے آواز ملا رہی تھی' جو اتنی سُریلی تھی کہ سارنگی کی صدا اور اس

کی آواز میں سننے والا مشکل سے تمیز کر سکتا تھا۔ میرے دل میں جذبۂ توصیف نے انگڑائی لی۔ میں نے خیال کیا۔ سبحان اللہ کیا دل کش آواز ہے جس میں اور سارنگی کی آواز میں اصلا فرق نہیں۔ اتنے میں پرنس نے مجھے مخاطب فرمایا۔

پرنس: "صدق دیکھ رہے ہو کیا سُریلی آواز ہے کہ سارنگی کی آواز اور ان کی آواز میں تمیز نہیں ہوتی۔"

میں: "سرکار! فدوی خود اس مشابہت آواز کے مزے لے رہا تھا، اور یہی بات خود کہنا چاہتا تھا کہ سرکار نے سبقت فرمائی اور میرے منہ کی بات چھین لی۔"

پرنس: "ہنس کر، چلو کیا ہوا، ہمارے اور تمہارے خیال میں توارُد ہو گیا۔ (فانی سے مخاطب فرما کر) کیوں فانی! اسی کا نام تو توارُد ہے؟"

فانی: (دست بستہ ہو کر) "بجا ارشاد ہوا یہی توارُد ہے۔"

حسبِ معمولی ۳ بجے محفل برخاست ہوئی، پرنس نے ہم سب کو رخصت کی اجازت دی۔ ہم دونوں باہر نکل کر موٹر پر بیٹھے ہی تھے کہ یکایک ایک پری چہرہ پیش خدمت دوڑ کر موٹر کے پاس آیا۔ مجھ سے کہنے لگا، آپ کو سرکار یاد فرما رہے ہیں۔ فانی سے کہا آپ جائیے۔ میں اس کے ساتھ ہو لیا۔ وہ مجھے لئے ہوئے ہل فورٹ کی ایک کشادہ چھت پر پہنچا، جہاں شطرنجی کا فرش تھا اور ایک کرسی پر پرنس رونق افروز تھے۔ میں آداب بجا لایا۔ پرنس نے فرمایا "صدق! رات اتنی تھوڑی باقی رہ گئی ہے کہ اس میں آرام کا خیال کرنا آرام و استراحت کی توہین کرنا ہے۔ اسی خیال سے میں نے تم کو واپس بلا لیا کہ اب تم

میرے ساتھ صبح کا ناشتہ کر کے گھر واپس جاؤ۔

میں : (دست بستہ ہو کر) "بہت صحیح ارشاد ہوا۔
اب تو فی الحقیقت سونے کا ارادہ کرنا بیٹھے بٹھائے شامتیوں میں
اپنا نام لکھوانا ہے۔ وائے برحالِ فانی۔"

پرنس : (خوش دلی سے تا دیر ہنستے رہے پھر خود ارشاد
فرمایا) "بے شک وائے برحالِ فانی!" پھر ایک پیش خدمت کو
حکم دیا: "تم فوراً ایک موٹر لے کر بنجارہ ہل جاؤ اور اختری کو اپنے ساتھ
لے آؤ۔ اگر سو گئی ہو تو جگا لینا۔ کہنا میرا حکم ہے۔ ایک سکنڈ کی تاخیر
نہ ہونے پائے۔" خدمت گار بہت خوب کہہ کر باہر کی طرف بھاگا۔
دوسرے خدمت گار کو حکم دیا "اختری کو ہماری طرف سے رخصتانے
میں جو تحائف دیئے جائیں گے، وہ حاضر کرو۔" وہ بہت خوب کہہ کر
توشہ خانے کی طرف بھاگا۔ پانچ منٹ کے اندر اختری نے حاضر
ہو کر سلام کیا۔ ارشاد ہوا کہ صبح اب قریب ہے میرے خیال
میں اس وقت سونے کے ارادے سے لیٹنا ....

(میں معترض سخن ہو کر) "دیدہ و دانستہ شب بیداری کا
ثواب کھونا ہے۔" پرنس ہنسنے لگے، اختری کو بھی بے اختیار
ہنسی آ گئی۔

اتنے میں خوش سلیقہ خدام نے تحائف سامنے رکھنے شروع
کئے۔ بارہ نقرئی کشتیوں میں ایک درجن جدا جدا ساڑیاں تھیں۔ ہر
ساڑی کے ساتھ بلاؤز کا بیش قیمت کپڑا تھا۔ ہر ساڑی قیمت میں
غالباً ایک ہزار کی تھی۔ نوار کا ایک پلنگ تھا، جس کے پائے ٹھوس

چاندی کے تھے۔ چاندی ہی کا ایک جالدار خوشنما صراحی اسٹینڈ تھا۔ بہت خوبصورت ایک نقرئی گلاس تھا۔ چاندی ہی کا ایک پان دان ایک ناگر دان اور ایک اُگال دان تھا۔ ایک بہت قیمتی رسٹ واچ تھی۔ خدام نے میرے سامنے اِس اہتمام اور سلیقے سے ان تحائف کو سجایا، جس طرح کسی امیر کی لڑکی کی رخصتی میں جہیز لڑکے والوں کے سامنے سجاتے ہیں۔

پرنس: "صدق! میری طرف سے یہ حقیر تحائف مہمان کی خدمت میں پیش کئے جاتے ہیں۔" اختری اٹھ کر آداب بجالائی۔

میں: "بجا ارشاد ہوا۔ لیکن ایسے خوش قسمت مہمان کی قسمت کی قسم کھانی چاہیئے، جس پر سرکار کی ایسی نظرِ عنایت ہو۔"

پرنس: "تحائف کا پیش کر دینا میرے لئے بہت آسان تھا لیکن ساڑی اور بلوز کے کپڑوں کی میچنگ کی داد صدق سے حاصل کرنا اتنا آسان نہ ہوگا۔"

میں: (دست بستہ ہوکر) سرکار کا ہر انتخاب اپنی جگہ لاجواب ہے بلکہ ان انتخابات کو دیکھ کر صاحبانِ بصیرت کو سبق لینا چاہیئے۔ خدا آنکھیں دے تو آنکھوں کو اتنا سلیقہ بھی عطا کرے۔ ہر بلاؤز ہر ساڑی پر ایسا موزوں ہے جیسے انگوٹھی پر نگینہ ہوتا ہے۔"

پرنس اپنے تحائف کی اس تنقید پر مسرور نظر آتے تھے اور غالباً اسی لئے انھوں نے مجھے روک لیا تھا۔ کہنے لگے "چلو میرا اطمینان ہو گیا۔ تمہاری باریک بینی کا میں قائل ہوں۔ میں اٹھ کر آداب بجالایا۔ اب یہ ارشاد ہوا، "صدق! جو رقم میں نے ان تحائف

کو مہیا کرنے میں صرف کر دی اگر وہی رقم میں ان کو بہ صورت نقد دے دیتا تو میرا خیال ہے ان کو اس سے زیادہ مسرت ہوتی، لیکن میری عادت ہے کہ جس کو جو کچھ دیتا ہوں، بہ صورتِ تحفہ ہی دیتا ہوں، نقد کبھی نہیں دیتا۔ نہ جانے کیا بات ہے؟"

میں: "فدوی اس راز کو خوب سمجھتا ہے۔"

پرنس: "تم کیا سمجھتے ہو؟ میں بھی تو سنوں۔"

میں: (دست بستہ ہو کر) "نقد روپیہ خواہ بادشاہِ وقت ہی کسی کو کیوں نہ عطا کرے لینے والا دل میں ایک طرح کی شرمندگی محسوس کرتا ہے۔ اس لئے سرکار جس کے ساتھ سلوک فرماتے ہیں، اسے شرمندہ کرنا پسند نہیں فرماتے بلکہ تحائف عطا فرما کر اس کے ساتھ سلوک ہوتے ہیں۔ یہ سرکار کی اعلیٰ ظرفی ہے۔"

پرنس: (خوش دلی سے) "خیر اب اسے تم جانو۔" اختری نے مجھ پر حیرت و استعجاب کی نظر ڈالی۔

پرنس اب اختری کی طرف متوجہ ہو گئے۔ فرمایا "میں اس وقت تم کو کچھ کھلانا چاہتا ہوں۔ تم اس وقت شوق سے کیا چیز کھانا پسند کرو گی؟"

اختری: (ہاتھ جوڑ کر) "ڈنر میں جو کچھ کھا چکی ہوں (گلے کی طرف ہاتھ سے اشارہ کر کے) وہی اب تک یہاں رکھا ہوا ہے، کیونکہ سونے کا موقع نہیں ملا۔ اس صورت میں کسی چیز کے کھانے کا سوال ہی کیا ہے۔"

پرنس: "نہیں کھانا تو تم کو ضرور پڑے گا، کیونکہ میرا بے اختیار

جی چاہتا ہے کہ تمہیں کچھ کھلاؤں، مگر چیز پسند کرنے کا حق میں تم کو دیتا ہوں۔ جو چیز کہو گی وہی کھلاؤں گا۔"

اختری اس سے بھی زیادہ سیانی تھی جتنا اس پیشے کی عورتیں بالعموم ہوتی ہیں۔ سوچ کر کہنے لگی، "اگر سرکار اسی پر بضد ہیں کہ میں کچھ ضرور کھاؤں تو اناناس کا مربّہ کھا لوں گی۔"

میرا دل دھڑکنے لگا کہ خدا ہی پرنس کی آبرو رکھے۔ بھلا چار بجے رات کو اناناس کا مربّہ کہاں سے آئے گا۔ دل میں میں نے اللہ سے پناہ مانگی کہ خدا اپنے بندوں کو اس قماش کی عورتوں سے بچائے۔

پرنس ایک پیش خدمت کی طرف مخاطب ہوئے۔ فرمایا، "ہمارے یہاں اناناس کا کچھ مربّہ ہوگا؟" خوب صورت خادم نے پہلے ادب سے سر جھکایا، پھر ہاتھ جوڑ کر بولا، "تھوڑا سا ضرور ہوگا۔" پرنس نے فرمایا، "لاؤ۔" خادم بہت خوب کہہ کر پیچھے ہٹا۔ چند منٹ میں کیا دیکھتا ہوں کہ وہ خادم آگے آگے ہے اور پانچ مضبوط آدمی، پانچ بڑے بڑے بلوریں مرتبان لیے ہوئے پیچھے پیچھے ہیں۔ اس سے پہلے میں نے اتنے بڑے مرتبان نہ دیکھے تھے۔ ہر مرتبان منہ تک اناناس کے تازہ مربّے سے بھرا ہوا تھا، اور کم از کم ہر ظرف میں بارہ سیر مربّہ تو ضرور تھا۔

میرے ہوش اڑ گئے، اور میں نے دل میں کہا کہ یہ شخص بے شک و شبہ شاہزادہ ہے۔ یہ ایک ایسا کڑا اور نازک امتحان تھا جس میں اودھ کے راجوں مہاراجوں کا ذکر کیا ہے، ہندوستان بھر کے والیانِ ملک فیل ہو جاتے۔

جن اُمرا کو میری یہ تحریر ناگوار گزرے وہ ازراہِ کرم زرا اپنے خدمتگار سے پوچھ دیکھیں کہ ہمارے یہاں انناس کا کچھ مربّہ ہوگا، اور اپنے خدمتگار کا جواب سنیں۔ اس کا امکان تو ہے کہ کسی بڑے امیر یا وزیر کے یہاں سیر دو سیر مربّہ نکل آئے۔ مگر ساٹھ ساٹھ سیر مربّہ کسی کے یہاں نکلنا، یہ شان صرف دکن کے جونیر پرنس ہی پر ختم ہے۔

اختری نے اپنے نزدیک چڑیا کے دودھ کی فرمائش کی تھی۔ اُسے یقینِ کامل تھا کہ چار بجے رات کو میری منہ مانگی چیز پرنس کے خدام مہیا نہ کر سکیں گے اور پرنس خفیف ہوں گے۔ مگر تموّل کا ہر کرشمہ دیکھ کر اس کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں اور دل میں نہایت خفیف ہوئی۔ خدمتگار نے طشتری اور چمچہ سامنے رکھ دیا۔ اور اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ایک مربّے کا نصف حصّہ کانٹے اور چھری کی مدد سے اپنی طشتری میں نکالا۔ زندگی میں ایسا لذیذ مربّہ کبھی کاہے کو کھایا ہوگا۔ مگر اس ڈر سے اس نے تعریف نہیں کی کہ پرنس کے حکم سے پھر اور کھانا پڑے گا۔

خدام نے وہ مرتبان سامنے سے ہٹا لیا اور میز صاف کردی اب پرنس نے اپنے تحائف کے بارے میں خدام کو حکم دیا کہ ان کو سلیقے سے ایک سوٹ کیس میں رکھ کر کل جس وقت یہ ٹرین میں سوار ہوں ان کے پاس رکھ دینا۔ اور ہر چیز ان کو دکھا دینا۔ کوئی شے تمہاری غفلت سے چھوٹ نہ جائے۔ اختری اٹھ کر آداب بجالائی۔ ارشاد ہوا کہ جاکر ہاتھ منہ دھو ڈالو۔ کیونکہ ناشتے کا وقت اب قریب ہے

اختری غسل خانے کی طرف گئی۔ پرنس نے اپنے اے ڈی سی مسٹر رضوی کو طلب فرمایا اور حکم دیا کہ صبح کو اختری جب بازار جائے

تو تم ساتھ رہنا اور یہ جو کچھ بازار سے خریدے اس کے دام تم میری طرف سے دے دینا۔ بہت خوب کہہ کر مسٹر رضوی اپنے کمرے کی طرف سدھارے ساڑھے چار کا وقت ہوگا جب پرنس نے ناشتہ کرنے کا حکم دیا اور وہیں ایک چھوٹی سی میز پر چار آدمیوں کے لیے ناشتہ لگا دیا گیا۔

ناشتہ بہت سادہ تھا، یعنی نہاری کے ساتھ صرف دو دو شیرمالیں تھیں۔ لیکن جب شیرمالوں کی بنیاد محض دودھ، گھی، میووں پر رکھی گئی ہو، ان کی لطافت اور ذائقے کا کیا کہنا۔ یہی صورت نہاری کی تھی جو ایسی لذیذ تھی، گویا کوئی نعمت ہو جو آج پہلے پہل کھانے میں آئی ہو۔ مختصر یہ کہ ٹھیک ۶ بجے صبح کو پرنس نے مجھے آرام کرنے کی اجازت دی۔ میں نے اس روز رخصتِ اتفاقی لے لی اور اطمینان سے ایک بجے دن تک سویا۔

چار بجے چائے پی کر فانی کے گھر گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ فانی کے آگے ایک تختہ کاغذ رکھا ہے اور وہ پورا تختہ جمع، باقی، ضرب، تقسیم وغیرہ سے سیاہ ہے۔ میں نے پوچھا کیا قرض خواہوں کا حساب ہے؟ فانی بولے نہیں، یہ اور ہی حساب ہے۔ پھر اس اجمال کی تفصیل اس طرح کی کہ ہمارے اور تمہارے بادشاہ عالی جاہ نے دونوں شاہزادوں کے حق میں ایک ٹرسٹ قائم کیا ہے اور ہر شاہزادے کے لیے دو کروڑ ستاون لاکھ، ستر ہزار (کچھ سیکڑہ بھی تھا جو مجھے یاد نہیں رہا) وقف کیے ہیں۔ میں اس رقم کا منافع جوڑ رہا تھا کہ اس وقت جب پرنس اس رقم سے مستفیض ہوں گے، ان کی سالانہ اور ماہانہ آمدنی کیا ہوگی۔ میں نے کہا، کچھ بھی ہو، ہمیں آپ کو اس سے کیا سروکار۔ فانی بولے "بالکل سروکار ہے، دیکھو ابھی پرنس کو پچیس ہزار ماہانہ تنخواہ ملتی ہے، جو ان کے شاہانہ

اخراجات کے لئے کفیل نہیں۔ خود وہ اکثر و بیشتر تنگ دست رہتے ہیں۔ ہمیں کہیں کہاں سے دیں۔ مگر جس روز سے اس وقت نامے کا نفاذ ہوگا اُن کی ماہانہ آمدنی کئی لاکھ ہوگی۔۔۔ میری پیشین گوئی پر یقین ہی نہیں ایمان رکھو۔ اُس وقت پرنس ہم تم دونوں سے مسلوک ہوں گے۔ ابھی مجبور ہیں جو کچھ پاتے ہیں ارباب نشاط ہی لے بھاگتے ہیں۔ خود ان کی گزر بہ مشکل ہوتی ہے ہماری طرف کیونکر متوجہ ہوں"۔

غرض خانی کے اسی حساب کتاب میں شام ہوگئی۔ دنیا کا کوئی بینک اُس روز انھوں نے شاید ہی نظر انداز کیا ہو، جس کی شرح سود کا حساب نہ لگایا ہو۔ اس وقت نہ ان کو خبر تھی نہ میں ہی جانتا تھا کہ جس دن اُس وقت نامے کے مطابق پرنس واقعی پرنس ہوں گے جہاں کے سکۂ رائج اعمال نیک ہیں۔

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

پیا کیسا تھ دگی

آج رات کو دربار کی نشست میں ایک بجے کا وقت جو کبھو مُنرت کا وقت ہوتا تھا اُس سمن اندام ومہ جبیں کے نہ ہونے سے سُونا سُونا معلوم ہوا۔ پرنس نے حکم دیا فوراً کیرلو کو جگا کر لاؤ۔ دس منٹ میں کیرلو حاضر ہو کر آداب بجالائے۔ اسّی برس کے بوڑھے اور مُعمّر آدمی، نا وقت

جگا دیئے جانے پر چیں بہ جبیں تھے۔

پرنس: (بہ کمال شفقت) "آؤ" کیریو آؤ۔ میں نے تمہیں ناوقت زحمت دی۔ مگر ایسی ہی مجبوری تھی کہ تمہیں تکلیف دینی پڑی"

کیریو: (گھبرا کر) "خیریت تو ہے سرکار!"

پرنس: "خیریت ہوتی تو ناوقت تم کو زحمت ہی کیوں دیتا (پیا کی طرف اشارہ فرما کر) دیکھو ان کی حالت مجھے کچھ اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ گھڑی دو گھڑی کے مہمان معلوم ہوتے ہیں" (پیا ذکرِ مرگ سُننا پسند نہ کرتے تھے)

پیا: (برہمی سے) "خانہ زاد بالکل اچھا ہے تندرست ہے۔ بُری بات منہ سے نہ نکالئے صاحب!"

پرنس: "(قدرت نواز جنگ سے مخاطب ہو کر) کیوں تمہاری کیا رائے ہے کیا پیا جیسا کہتے ہیں فی الحقیقت ویسے ہی ہیں؟"

قدرت نواز جنگ (پیا کی صورت بہ غور دیکھ کر) "چہرے پر مُردنی چھائی ہوئی تو فدوی کو بھی معلوم ہوتی ہے۔ یوں بچ جائیں تو دوسری بات ہے"

پیا: "مُردنی چھائے تمہارے منہ پر۔ (پرنس سے مخاطب ہو کر) اس کو بکنے دیجیئے۔ خانہ زاد بالکل صحیح و تندرست ہے۔"

کیریو: "سرکار! تو کیا میں سورۂ یٰسین شروع کروں؟"

پیا: "سورۂ یٰسین اپنے ہوتوں سوتوں کے سرہانے پڑھو۔ یہ کیا فضول بکواس نکالی ہے"

پرنس: (ایک خادم سے) دیکھو! تم کرنل واگھرے کے گھر پر ٹیلیفون کرو اور جو آدمی تم سے بات کرے، اس سے کہو کہ کرنل واگھرے کو فوراً"

میرے پاس بھیج دے۔ ایک جاں بہ لب مریض کو دیکھنا اور دَوا دینا ہے۔"

پپیا: "خدا نہ کرے صاحب۔ غلام آپ کے روبرو صحیح و تندرست بیٹھا ہے۔ فالِ بد منہ سے نہ نکالئے۔"

پندرہ منٹ میں کرنل واگھرے (مشہور و ممتاز ڈاکٹر) دربار میں حاضر ہو کر آداب بجالائے۔

پرنس: "واگھرے! تم ذرا پپیا کا معائنہ کرکے بتاؤ، یہ زیادہ سے زیادہ کتنے گھنٹے اور زندہ رہیں گے۔"

واگھرے: (پپیا کو بہ یک نظر دیکھ کر) "سرکار اب ان میں باقی کیا رہا ہے۔ زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے اور زندہ رہیں گے۔"

پپیا: "بکتے ہو، دو گھنٹے کے اندر تم خود ہی مرو گے۔ میں تو انشاء اللہ ابھی مدتوں زندہ رہوں گا۔"

پرنس: "واگھرے! تم پپیا کا علاج کرسکو گے یا کیر یو سورۂ یٰسین شروع کریں؟"

واگھرے: "میری رائے میں علاج کا وقت تو باقی نہیں رہا۔ سورۂ یٰسین ہی سنانے کا وقت ہے۔"

پپیا: (برہمی سے) ظاہر ہے کہ بھلے چنگے آدمی کے علاج کا کوئی محل نہیں۔ البتہ تم اپنے دماغ کا علاج کسی دوسرے ڈاکٹر سے ضرور کراؤ۔"

قدرت نواز جنگ: فدوی کی رائے میں پہلے ان کو قرآن کی ہوا دے کر دیکھ لیا جائے۔ شاید شافیِ مطلق شفا ہی دے دے۔"

پپیا: "پہلے اپنے ہوش کی دَوا کرو، جو اتنے بڑے دربار میں آؤ باؤ بک رہے ہو۔ (پرنس سے مخاطب ہو کر) صاحب! مجھے ایک شعر یاد

آگیا ہے، اسے سماعت فرمائیے۔" یہ کہہ کر پیا نے شعر پڑھا۔

قرآن کی ہوا دیتے ہیں یہ احباب مصر ہیں
میں کہہ نہیں سکتا ترے دامن کی ہوا ہو

پرنس پھڑک گئے، کئی بار پیا سے یہ شعر پڑھوایا۔ خود مزے لے لے کر کئی بار پڑھا۔ فانی کی طرف دیکھ کر فرمایا" بہت اچھا شعر ہے" فانی نے بھی تعریف کی غرض اِسی شعر پر اس مذاق کا خاتمہ ہو گیا۔

ناظرین نے دیکھا، پرنس کا دربار، دربار کیسا ستھرا، پاکیزہ اور شائستہ تھا، جہاں ہنسی دل لگی بھی اُسی حد تک جائز سمجھی جاتی تھی جہاں پر کسی مہذب سے مہذب آدمی کا اعتراض و گرفت کا موقع نہ ملے۔

میں نے یوپی سے مردم خیز خطے میں آنکھ کھولی۔ ہوش سنبھالا تو لکھنؤ میں کیسے کیسے باکمالوں کو دیکھا، جن کا جواب زمانہ اب صدیوں کی گردش کے بعد بھی پیدا نہ کر سکے گا یوں صفِ اوّل کے سخن فہم بھی نظر سے گزرے۔ لیکن انصاف کی بات یہ ہے کہ پرنس معظم جاہ اور مہاراجا کشن پرشاد سے بہتر سخن فہم میرے دیکھنے میں آج تک نہ آیا۔ مہاراجا دوسری دنیا میں ہیں۔ پرنس سے میرا اب کوئی تعلق نہیں۔ اس لیے خوشامد کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جو کچھ ہے، اظہارِ حقیقت ہے۔

دوسری شام کو حسبِ معمول فانی کے ساتھ ہل فورٹ پہنچا تو یہ دیکھ کر سخت حیران ہوا، کہ آج مصاحب بڑی آزادی سے بات چیت کر رہے ہیں۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ پرنس کہیں باہر گئے ہوئے ہیں اور ساڑھے نو بجے سے پہلے واپس نہ آئیں گے۔

تھوڑی دیر میں ایک صاحب جمال پیش خدمت نے میرے، اور فانی کے سامنے گول میز لاکر رکھی۔ اس کے بعد کشتی میں چند خربوزے لے آیا، جو اسی وقت ریفریجریٹر سے نکال کر لایا تھا۔ خود ہی اُسے بیچ سے تراشا۔ پھر اس کے بیج علحدہ کیے۔ بیجوں کی علحدگی کے بعد پھل کے دونوں کٹوروں کو بالائی سے بھرا اور اب اُن ٹکڑوں کو ایک قیمتی اور خوش نما پلیٹ میں ہم دونوں کے سامنے رکھا۔ ہم دونوں حیرت سے اس کا منہ دیکھنے لگے۔ اُس نے مسکرا کر کہا "کھائیے" اور ایک ایک چمچہ بھی ہماری پلیٹوں میں رکھ دیا۔ فانی نے پوچھا "کیا سرکار اس کے لئے تمہیں حکم دے گئے ہیں؟" اس نے مسکرا کر انکاری سر ہلایا اور کہا "بالکل نہیں یہ اپنی طرف سے آپ لوگوں کی مدارت کررہا ہوں۔" میں نے سوال کیا "تمہیں ہم لوگوں کی مدارت کا خیال کیوں آیا؟" کہنے لگا "آپ لوگوں کی شاعری کا دل دلوہ ہوں۔" میں نے پوچھا "تم تعلیم یافتہ معلوم ہوتے ہو" کہنے لگا "ہاں ہائی اسکول کے امتحان میں شریک ہوا تھا بدقسمتی سے فیل ہوگیا۔"

ہم دونوں نے اس کے پاس خاطر سے اپنا اپنا ٹکڑا کھایا۔ خاصے کا پھل، خاصے کی بالائی، ریفریجریٹر میں ٹھنڈا کیا ہوا خربوزہ چکھا تو وہ لذت پائی گویا فردوسِ بریں کا پھل کھا رہا ہوں۔ اتنے میں اس نے دوسرے خربوزے کو صاف کرکے اُس کی کٹوری میں بالائی بھری۔ ہم دونوں نے دو دو ٹکڑے کھائے۔ خدمت گار کا نام یاد نہیں آتا۔ خدا اُسے شاد کام رکھے۔

پرنس ٹھیک ساڑھے نو بجے تشریف لائے۔ خاصے

پر پُرلطف باتیں رہیں۔ دربار کی نشست میں فانی کی اصطلاح میں آج پھر ایک حادثہ پیش آیا۔

دو بجے ہوں گے، معزز سرکاری غزل الاپ کر رہے تھے، ہر شخص داد و توصیف کے نشے میں سرشار تھا، کہ ایک پرنس نے قدرے سخت لہجے میں حکم دیا "دوسری آنکھ بھی ملو"۔ اس حکم پر مجھے اپنی ہی صف میں ایک ہل چل سی محسوس ہوئی۔ میں نے جھک کر پوری صف پر نظر ڈالی۔ دیکھا کہ ماہر القادری دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھیں مَل رہے ہیں۔ میں مسکرا کر سیدھا اپنی جگہ بیٹھ گیا۔

بات یہ تھی کہ خانوادۂ شاہی میں ایک آنکھ کے کھجانے یا ملنے کو منحوس خیال کیا جاتا تھا۔ اس لئے حکم عام تھا کہ ایک آنکھ میں کھجلی ہو تو بہ یک وقت دونوں آنکھیں مل جائیں۔ ماہر القادری نے ضرورت کے مطابق شاید ایک ہی آنکھ کھجائی تھی۔ ماہر خوش قسمت تھے کہ پرنس کا دربار تھا۔ اعلیٰ حضرت سلطانِ دکن کے سامنے اس قسم کی غلطی بہ مقتضائے بشریت سرزد ہو جاتی تو قیامت کا سامنا تھا۔ میرے پچیس سالہ قیام کے زمانے میں، نہ جانے کتنے بندگانِ خدا اس ایک خفیف حرکت پر مغضوب و معتوب ہوئے کوئی خطبہ سنتے وقت مسجد سے نکالا گیا، کوئی سرِ دربار ذلیل ہوا کسی کو محفلِ میلاد سے نکالا گیا۔ بے چارے ماہر ایک ذرا سی تہدید ہی پر شرمسار نظر آتے تھے۔

آج دربار میں یہ بھی معلوم ہوا کہ پرسوں شام کی ٹرین سے پرنس گرمیاں گزارنے پیرس تشریف لے جائیں گے۔ فانی نے اطمینان

گی ہنانس لی۔ مجھ سے کہنے لگے "چلو اب تین مہینے راتوں کو آرام سے سوئیں گے۔ اس مرغ پلاؤ اور کباب ماہی سے اپنے گھر کا دال دلیا ہزار درجے بہتر ہے کہ دن اپنے راتیں اپنی ہوں گی۔" میں نے کہا "یقیناً بہتر ہے بشرطیکہ ہل فورٹ کی بالائی کے ساتھ روزانہ پستی توز بھی ملتے رہیں۔" فانی ہنس دیئے۔ بولے "اس کا تو کوئی امکان نہیں، وہ تو شب بیداری اور مصاحبت کی مشقت کے ساتھ ہی مشروط ہیں۔

دربار کی آخری رات

پرنس کا سفرِ یورپ

دوسری رات کو جسے اس سیزن میں دربار کی آخری رات کہنا بے جا نہ ہوگا، کیا دیکھتا ہوں کہ ۲۵ بلکہ ۲۷ برس کا ایک جوان آدمی ملتانی نام نرت کے لئے چوکی پر بیٹھا، اور لگا مٹکنے۔ پرنس کو موقعے موقعے سے داد دیتا دیکھ کر اک جنگ اور ڈھک جنگ بھی اچھلنے کودنے لگے میں اپنے دل میں ہنس رہا تھا، کہ ان دونوں کو ذرا پاس خودداری نہیں۔ غرضیکہ نرت کا وہ گھنٹہ بڑی بے لطفی سے کٹا۔ میں اس عرصے میں خاموش سگریٹ پر سگریٹ پیتا رہا۔ معلوم ہوا کہ اس پری زاد کی جگہ اب اس دیوزاد کا تقرر ہوا ہے۔ اس روز سے نرت کا گھنٹہ میرے حق میں مستقل عذاب بن گیا۔ مگر مجبوری تھی۔

جو کچھ فلک دکھائے سو ناچار دیکھنا

پرنس اپنی خداداد ذہانت سے پہلے ہی دن سمجھ گئے کہ صدق کو یہ تماشا پسند نہیں آیا مگر خاموش رہے۔ رات کو حسب معمول ۲ بجے جب پرنس نے سب کو خدا حافظ کہا تو مجھ سے ارشاد فرمایا "تم میرے ساتھ آؤ" مجھے اپنے ساتھ لئے ہوئے ہل فورٹ کی ایک کشادہ چھت پر پہنچے جہاں ان کے ساتھ جانے والا سامان بندھ رہا تھا۔ خدام نے دو کرسیاں فوراً ڈال دیں۔ خود بیٹھ کر مجھے بیٹھنے کا حکم دیا۔ اب میں نے ساتھ جانے والے سامان پر نظر ڈالی۔ کم و بیش سوا سو ڈیڑھ سو تو صرف ہاتھ کی چھڑیاں (واکنگ اسٹک) تھیں۔ جو ایک سے ایک خوبصورت اور بیش قیمت تھیں۔ یوں ہی تقریباً دو سو جوڑ ولایتی جوتے ادھر ادھر پڑے ہوئے تھے۔ خدام نے ساتھ جانے کے لئے ان کو ہزاروں قیمتی جوتوں سے علحدہ کیا تھا۔ ان کی قیمتوں کا اندازہ کرنا میرے بس کی بات نہ تھی۔ یہی صورت جرابوں کی تھی۔ بے شمار قیمتی موزوں کی جوڑیاں کرسیوں، میزوں اور خوش نما اسٹینڈوں پر بکھری پڑی تھیں، جن میں گھٹیا سے گھٹیا جوڑہ بیس روپے سے کم کی نہ تھی۔ اسی طرح ہزارہا سوٹ جو سب کے سب لندن یا پیرس کی سلائی کا اعلیٰ نمونہ تھے، جا بجا پلنگ اور مسہریوں پر پڑے ہوئے تھے۔ ٹائیوں کی قطار پر نظر ڈالی تو آنکھوں میں خیرگی سی ہونے لگی۔ ایک ہزار سے کچھ اوپر ٹائیاں بھی ہوں گی، جن کو سلیقہ مند خدام نے دس ہزار ٹائیوں سے چھانٹا ہوگا۔ میں ان کی قیمتوں کا بھی اندازہ لگانے سے قاصر رہا کیونکہ سب کی سب نہایت بیش قیمت تھیں۔

پرنس اب مجھ سے مخاطب ہوئے۔ ارشاد فرمایا "تم کہتے ہوگے کہ مجھے آج کس کباڑخانے میں لا بٹھایا ہے۔ مگر میں ساتھ جانے والے سامان کو ایک نظر دیکھنا چاہتا تھا اور یہ بھی چاہتا تھا کہ تم سے باتیں بھی کرتا جاؤں۔"

میں نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا "خانہ زاد حاضر ہے۔ سرکار شوق سے سامانِ سفر ملاحظہ فرمائیں۔" لیکن دل میں سوچتا تھا، یاالہ العالمین! جو لوگ اس قدر ساز و سامان کے ساتھ دنیوی سفر کرنے کے عادی ہیں وہ بھی سفرِ عدم میں کوئی شے ساتھ نہیں لے جا سکتے۔ اس دنیا اس دنیا کا دور دراز سفر، ہمراہ نہ کوئی رفیق نہ خدمت گار، نہ بستر، نہ تکیہ، نہ مسند، نہ مسہری۔ آخر مسافرانِ عدم پر کیا گزرتی ہوگی؟ دل نے تو کوئی جواب نہ دیا مگر میں نے پورے جسم میں تھرتھری سی محسوس کی۔ اسی عالمِ تصوّر میں پالنے والے کو پکار اٹھا، اے رحیم و کریم! اس مشکل کے وقت مجھ سے گناہ گار کو تیرا ہی آسرا اور سہارا ہے۔

اتنے میں پرنس پھر مجھ سے مخاطب ہوئے۔ فرمایا "کل تم مجھے خدا حافظ کہنے بیگم پیٹھ کے اسٹیشن پر آنا۔ نام پلی اسٹیشن پر بہت مجمع ہوگا۔" میں نے کہا "بہت خوب۔" فرمایا "فانی سے بھی کہہ دینا۔" میں نے عرض کیا "ہم دونوں ساتھ حاضر ہوں گے۔"

غرض وہ رات بھی باتوں میں کٹ گئی۔ پرنس کے ساتھ ناشتہ کر کے گھر پلٹا۔ سونے سے پہلے میں نے جی، ایم خان کو چٹھی لکھی کہ آج شام کو میں چار ساڑھے چار بجے کے درمیان آپ کے

دولت کدے پر حاضری دوں گا' میرا انتظار کیجیے گا۔ پرنس سات بجے شام کی ٹرین سے گرمیاں گزارنے کی غرض سے یورپ تشریف لے جا رہے ہیں۔ آپ کو نزدیک سے انھیں دیکھنے کی حسرت ہے۔ آج سے بہتر اس کا موقع نہ ملے گا کہ آپ ان کو قریب سے دیکھیں اور وہ بھی آپ کو نہ دیکھ سکیں۔ یہ خط لکھ کر میں نے مَوٹو کے حوالے کیا کہ تم سات بجے صبح تک بائیسکل پر جا کر کرنل صاحب کو دے آنا۔ (مَوٹو میرے بورڈرا اور بہت دلچسپ شخصیت کے طالب علم تھے) دس روپے کا ایک نوٹ دے کر انھیں یہ بھی تاکید کر دی کر واپس ہوتے ہوئے زردوزوں کی دوکان سے اوسط درجے کا ایک امام ضامن بھی خرید لینا۔ ان کاموں سے فرصت پا کر میں اپنی خواب گاہ میں جا کر سو رہا۔ آنکھ کھلی تو ٹھیک دوپہر کا وقت تھا۔ ہاتھ منہ دھو کر چائے کی دو پیالیوں سے نیند کا خمار دور کیا۔ مَوٹو کو بلا کر دریافت کیا کہ تمھارے سپرد جو کام کیے گئے تھے' اُن کا کیا حشر ہوا۔ وہ کہنے لگا کرنل صاحب کا خط تو دے آیا انھوں نے خط پڑھ کر کہا کہ میں آپ کا منتظر رہوں گا۔ چائے میرے ساتھ ہی پیجیے گا۔ مگر صاحب جو چیز آپ نے لانے کے لئے کہی تھی بازار جاتے جاتے' اس کا نام ہی حافظے میں محفوظ نہ رہا۔ بہت سوچا بہت ذہن پر زور دیا' مگر وہ نام کسی طرح یاد ہی نہ آیا۔ میں ابھی لاتا ہوں' اب کے مہربانی فرما کر ایک کاغذ کے پرزے پر اس کا نام لکھ دیجیے۔ میں نے مسکرا کر ایک پرزے کاغذ پر زردوز کی دوکان اور امام ضامن لکھ کر ان کے حوالے کیا۔ بارے اب کی مَوٹو امام ضامن خرید لائے۔

چار بجے کرائے کی موٹر منگوا کر فانی کے گھر پہنچا۔ وہ کہنے لگے

ٹرین تو سات بجے جاتی ہے اور تم ابھی سے تیار ہو کر آئے ہو۔ میں نے کہا باتوں میں وقت ضائع نہ کیجیے' اور دو منٹ میں تیار ہو جائیے۔ فانی کہنے لگے' میں نے ابھی چائے نہیں پی' ایک پیالی چائے کی تو پی لینے دو۔ میں نے کہا اس کی فکر نہ کیجیے' وہ وقت پر خود مل جائے گی۔ غرض فانی کو ساتھ لیا اور ٹھیک ساڑھے چار بجے ہم دونوں کرنل صاحب کے دولت کدے پر گاڑی سے اُترے۔

کرنل نے ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ میں نے فانی سے ملوایا۔ کرنل صاحب نے اب تک فانی کا نام ہی سُنا تھا' کہیں دیکھنے کا موقع نہ ملا تھا۔ اُن کو اپنے گھر پر دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ کئی بار میرا شکریہ ادا کیا۔ پھر ہمیں نشست گاہ میں بٹھا کر نوکر کو آواز دی۔ مستان صاحب! مستان صاحب!! کئی آوازوں کے بعد اندر سے "جی آیا" کی آواز آئی اور ایک منٹ کے اندر مستان صاحب سامنے آ کر کھڑے ہو گئے۔

مستان صاحب سولہ سترہ سال کی عمر کے نوخیز پیش خدمت تھے۔ چہرے کا رنگ سیاہی مائل تھا۔ سر پر انگریزی بال تھے' جن کو تیل سے بہت کم' مگر گرد راہ سے ہمہ وقت سابقہ رہتا تھا۔ ظاہری شکل و صورت اور قیافہ بالکل ویسا ہی تھا جیسا عموماً آوارہ گرد چھوکروں کا ہوتا ہے۔ آنکھوں سے شرارت ٹپکتی تھی۔ جسم پر اس وقت صرف ایک نیکر تھا۔ معلوم ہوتا تھا باورچی خانے سے اٹھ کر آ رہے ہیں

کرنل : "اندر سے جھنکن لا کر میز صاف کر اور بیگم صاحب کو بول مہمان آ گئے ہیں۔ چائے فوراً باہر بھیجیں۔"

مستان صاحب اندر سے ایک کثیف اور میلا تولیا اُٹھا کر لائے جس نے شاید دو چار مہینے سے دھوبی کا منہ نہ دیکھا تھا۔ کرنل اس بے تمیزی پر آگ ہو گئے۔ بولے "ابے حرام کے جھکن اٹھا کے لا، یہ کیا چیکٹ کپڑا اٹھا لایا ہے (چیکٹ بہ نہایت کثیف) مستان صاحب مسکراتے ہوئے پھر اندر بھاگے۔ بارے اس دفعہ جھاڑن لے آئے۔ میز صاف کی اور اندر سے چائے کا سٹ لا کر میز پر رکھا۔ چائے کے ساتھ دو قسم کے اچھے بکٹ اور ہر شخص کے لیے دو دو نیم برشت انڈے تھے۔ ہم لوگ اپنی جگہ سے اٹھ کر چائے کی میز کے پاس گئے۔ کرنل نے ہماری پیالیاں بھریں اور ہم لوگ کے ٹی ای آر بینچ پیکو کا مشروب ذوق و شوق سے کرنل کے ساتھ پینے لگے۔

نشست گاہ میں تین کھڑکیاں تھیں جو اس وقت بند تھیں۔ کرنل نے مستان صاحب کو حکم دیا "تنبیاں سب کھول دے اور بیگم صاحب کو بول ہمارے صندوق سے ایک صاف قمیص اور اچھی سی گرگی (پاجامہ) نکال دیں۔ اور دیکھو یہ بھی بولنا کہ ہمارا ڈبہ اور تھیلا (یعنی پان کی ڈبیہ اور بٹوہ) بھی تیار کر دیں۔"

دس منٹ میں ہم نے چائے ختم کی اور پانچ منٹ میں کرنل صاف قمیص اور سفید گرگی میں ملبوس اپنی سیاہ شیروانی اور سیاہ ٹوپی پہنے اندر سے نکل آئے۔

مستان صاحب نے پان کی ڈبیا اور بٹوہ میز پر رکھ کر کہا، صاحب ڈبہ اور تھیلا لے آیا۔ کرنل صاحب نے ایک ایک پان سے ہماری تواضع کی پھر ایک بیڑا خود منہ میں رکھا۔ چھ بجے تک میں اور

قانی کرنل کی زبان اور اندازِ بیان سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ ٹھیک چھ بجے کرنل کے ساتھ موٹر پر بیٹھ کر نام پلی ریلوے اسٹیشن پہنچے یہاں اس وقت کم از کم دو سو موٹریں قطار در قطار قاعدے سے لگی ہوئی تھیں میں نے ڈرائیور کو ہدایت کی کہ اپنی موٹر گیٹ کے باہر سب سے الگ تھلگ رکھنا۔ کیونکہ ہم لوگ کچھ دیر میں بیگم پیٹھ ریلوے اسٹیشن چلیں گے۔ یہ کہہ کر میں کرنل کو لئے ہوئے ریلوے آہنی پھاٹک سے گزر کر پلیٹ فارم پر پہنچا۔ ہنوز ٹرین کے آنے میں پورے ایک گھنٹے کی دیر تھی پھر بھی تین چار سو آدمی سروں پر کتھئی رنگ کی دستاریں جمائے کمروں سے بکلوس باندھے پلیٹ فارم پر موجود تھے۔

کرنل: "آ بابابا! کیا ہندواں، مسلماناں، انگریزاں، پارسیاں اکٹھا ہوئے ہیں۔ جیسے کوئی میلا" (الٰہی توبہ! کس قدر ہندو، مسلمان، انگریز، پارسی جمع ہیں۔ جیسے میلے میں آئے ہوں)۔"

میں: "کرنل صاحب! ابھی آپ نے کیا دیکھا۔ تین دن پہلے امرا اور امیر زادے ہل فورٹ میں حاضر ہو ہو کر امام ضامن باندھ رہے ہیں۔ اس وقت تک دو چار ہزار امام ضامن تو پرنس کے دولت کدے پر باندھے جا چکے ہیں۔ یہاں تو صرف وہ لوگ آئے ہیں جو محل میں باریاب نہ ہو سکے تھے۔ اس کے علاوہ ابھی ٹرین کے آنے میں پورے ایک گھنٹہ کی دیر ہے۔ ساڑھے چھ بجے سے ارکانِ سلطنت اور بڑے بڑے امرائے دولت آنا شروع ہو جائیں گے، اور پونے سات بجے تو پورے پلیٹ فارم پر آپ کو تل دھرنے کی جگہ نظر نہ آئے گی۔ باہر کم از کم ہزار ڈیڑھ ہزار موٹریں کھڑی دکھائی دیں گی۔"

کرنل :" حسبنا اللہ ونعم الوکیل "
قائل :" پس سمجھتے ہیں، پورا مجمع تو آپ چھ نے سات بجے ہی دیکھ سکیں گے "
کرنل :(مجھ سے مخاطب ہوکر)" اچھا یہ بولو، میرے خیال میں چار پانچ ہزار روپے تو امام ضامن ہی کی مد میں آجاتا ہوگا "
میں :" اس سے بھی زیادہ کم ازکم چھ سات ہزار "
کرنل :" پھر اتنا روپیہ صرف کس مد میں ہوتا ہے ؟ "
میں :" نواب شہید یار جنگ غربا اور مساکین میں صرف کر دیتے ہیں "
کرنل :" میاں سب کہنے کی باتیں ہیں۔ ہزار ڈیڑھ ہزار غریبوں کو دیتے ہوں گے۔ تو پانچ چھ ہزار اپنے ڈبے میں رکھتے ہوں گے تم لوگاں بھی حصہ پاتے ہوں گے۔ بھئی معاف کرنا آپن تو صاف گو آدمی ہیں۔ حسبنا اللہ ونعم الوکیل "

ساڑھے چھ بجے سے خاص خاص امیر و وزیر آنا شروع ہوئے اور پونے سات بجے نام پلی ریلوے اسٹیشن کا وسیع پلیٹ فارم آدمیوں کی کثرت سے پانی سے لب ریز کٹورے کی طرح چھلکنے لگا۔

چھ بج کر پچاس منٹ پر پرنس اپنی موٹر سے اترے ــــ پلیٹ فارم پر تشریف لائے، چھ سات ہزار آدمیوں کے ہجوم میں ایسا سناٹا چھا گیا، گویا پلیٹ فارم پر کسی ذی روح کا وجود ہی نہ ہو ــ جدھر سے گزرتے تھے پرے کا پرا فرشی سلاموں میں مصروف ہو جاتا تھا۔ سیکڑوں کی تعداد میں یہاں امام ضامن باندھے گئے۔ پھولوں

کے بے شمار ہار پرنس کو پہنائے گئے۔ جب پورا بازو امام ضامن سے بھر جاتا تھا تو ایک خدمت گار انھیں کھولنا شروع کر دیتا تھا۔ اس وقت لوگ دوسرے بازو میں باندھنا شروع کر دیتے۔ پھولوں کے ہار پرنس خود اُتار اُتار کر دوسرے خادم کو دیتے تھے۔

چھ بج کے پچپن منٹ پر سیٹیاں بجنے لگیں۔ یہ اعلیٰ حضرت سلطانِ دکن کی آمد آمد کی علامت تھی۔

کرنل: (میرا بازو پکڑ کر) "بھئی خدا کے لئے اب بھاگو یہاں سے نہیں تو پھر اس مجمع سے نکلنا مشکل ہو جائے گا۔ ہماری جان تو ابھی سے تھوڑی تھوڑی ہو رہی ہے۔"

میں: "کرنل صاحب! سرکار کی تشریف آوری کا تماشا بھی دیکھ لیجئے۔" ابھی تو ٹرین ہی نہیں آئی۔ آئے گی تو کم از کم دس منٹ یہاں رُکے گی۔ اتنا وقت ہم لوگوں کے نکل چلنے کے لئے کافی ہوگا۔"

کرنل: "نہ بابا! اپن ایسے تماشے سے درگزرے جس میں جان کا خطرہ ہو۔ ہمارا دل تو ابھی سے دُھک دُھک بول رہا ہے۔" یہ کہہ کر کرنل مجھے بازو سے گھسیٹتے ہوئے تار کی طرف لے گئے۔ تار پھاند پھاند کر ہم لوگ باہر نکلے۔ اس وقت باہر کے وسیع و عریض کمپاؤنڈ میں کم از کم ایک ہزار موٹریں ضرور کھڑی ہو گی۔

ہم لوگ تیز قدم چل کر اپنی گاڑی کی قریب پہنچے۔ ہنوز گاڑی پر قدم نہ رکھنے پائے تھے کہ سرکار کی سواری مثل باد بہاری سامنے آ پہنچی اور پلک جھپکانے میں بھی تو کچھ دیر ہوتی ہے وہ

اس سے بھی پہلے ہمارے سامنے سے گزر گئی۔ میں نے فانی سے مخاطب ہوکر شعر پڑھا:

موٹر کی وہ رفتار کہ ہو مانع دیدار
آنکھوں کو یہ ارماں کہ تجلی نظر آئے

اب کرنل کے گم شدہ حواس بھی بجا ہو چکے تھے۔ کہنے لگے موٹر پر بیٹھو تو موقع کا شعر ہم سنائیں گے۔ تمہارے شعر کی جس کے آگے کوئی حقیقت نہیں۔

موٹر چلی تو فانی نے کرنل سے کہا "ہاں کرنل صاحب آپ کیا شعر سنانے والے تھے؟"

کرنل مزے لے لے کر یہ شعر گانے لگے:

دھیم بول کو آیا شیر
دھیم بول کو کودا شیر

فانی سے کرنل کی پہلی ملاقات تھی، مگر انھیں ہنسی ضبط کرنا دشوار ہو گیا۔ لوٹ ہی تو گئے اور خوب جی بھر کے ہنسے۔ پھر کرنل سے پوچھا "خدارا! دھیم بول کو" کے پہلے معنی تو بتائیے تاکہ میں شعر کا پورا لطف اٹھا سکوں۔

کرنل: "باجے کی آواز کے ساتھ، یعنی ڈھول اور تاشے کے ساتھ۔" فانی پھر لوٹ پوٹ ہو گئے۔ "کرنل صاحب! وہاں باجا کہاں تھا؟"

کرنل: "سیٹیاں تو تھیں اسی کو باجا سمجھ [illegible]"

اتنے میں شہر کا اگلا ریلوے اسٹیشن بھیم پیٹھ آ گیا۔ [illegible] وقت:

پرنس کے اسٹاف کے صرف دس بارہ آدمی اطمینان کے ساتھ انھیں خدا حافظ کہنے کے لیے موجود تھے۔ میں فانی کے ساتھ اندر گیا کرنل تارکے باہر کھڑے رہے۔ ہمارے پہنچتے ہی ٹرین بھی آگئی۔ پرنس کا سیلون دیکھتے ہی ہم سب دوڑ کر سیلون کے پاس پہنچے۔ جو خادم اُس وقت سیلون میں موجود تھا اُس نے بہ عجلت دروازہ کھول دیا۔ پہلے فانی آداب بجالائے پھر میرا سلام ہوا۔ امام ضامن باندھنے میں میں نے سبقت کی۔ میرے بعد فانی نے باندھا۔ پرنس ہم دونوں سے بہ شفقت پیش آئے۔ ارشاد فرمایا:" اب تم لوگ تین مہینے آرام کرو۔ ہماری وجہ سے رات رات بھر سو نہ سکتے تھے۔"

میں: (دست بستہ ہو کر)" آرام و سکون کی ہم خانہ زادوں کو اتنی پروا نہیں، جتنا یہ غم کھایا جاتا ہے کہ پورے تین دن شب بیداری کے ثواب سے محروم رہیں گے۔"

پرنس ہنسنے لگے۔ اتنے میں گارڈ نے سیٹی دی۔ ہم دونوں نے سلام رخصت کیا اور پرنس کو خدا حافظ کہہ کر ٹرین سے اُتر آئے۔ گاڑی رینگنی اور ایک دفعہ پھر ہم لوگ آداب بجالائے۔ انجن سیاہ دُھواں مُنہ سے چھوڑتا ہوا چشم زدن میں ٹرین کو کھینچ کر لے گیا۔